شذرات

قرآنیات

معارف نبوی

نقطۂ نظر

اصلاح و دعوت

www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

مسلمانوں کا زوال

مسلمان کم و بیش ایک ہزار سال تک دنیا کی ایک بڑی طاقت رہے ہیں۔ علم و حکمت، تدبیر و سیاست اور دولت و حشمت میں کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ پوری دنیا پر حکومت کر رہے تھے۔ یہ بادشاہی خدا نے اُنھیں دی تھی اور خدا ہی نے اُن سے چھین لی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ سرفرازی کے لیے تو جسے چاہتا ہے، اپنے قانون ابتلا کے مطابق منتخب کر لیتا ہے، لیکن جب ایک مرتبہ منتخب کر لیتا ہے تو اُس کی یہ حالت اُسی وقت تبدیل کرتا ہے، جب علم و اخلاق کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو پوری طرح پستی میں گرا دیتی ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ ایک دوسرا معاملہ بھی ہوا ہے۔ اُن کی اصل ہمیشہ عرب رہے ہیں۔ وہ زیادہ تر بنی اسمٰعیل ہیں اور بنی اسمٰعیل کے بارے میں معلوم ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت ہیں۔ چنانچہ اُن پر اُس سنت الٰہی کا اطلاق بھی ہوتا ہے جو قرآن میں ذریت ابراہیم سے متعلق بیان ہوئی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ یہ لوگ اگر حق پر قائم ہوں تو اِنھیں قوموں کی امامت حاصل ہو گی اور اُس سے انحراف کریں تو اِس منصب سے معزول کر کے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیے جائیں گے۔

چنانچہ مسلمان اگر اِس عذاب میں مبتلا ہیں تو یہ کوئی الل ٹپ معاملہ نہیں ہے اور نہ دوسروں کی سازش کے نتیجے میں ہوا ہے، جس طرح کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی زعما بالعموم کہتے ہیں۔ اِس کے متعین اسباب ہیں، یہ اُنھی کے تحت ہوا ہے۔ اِس کے پیچھے خدا کا قانون عزل و نصب کارفرما ہے۔ اُس کی روشنی میں اِسے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو زوال کے اسباب بالکل واضح ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔

یہ بنیادی طور پر تین ہیں:

اولاً، مسلمان کتاب الٰہی کے حامل بنائے گئے تھے۔ یہ محض کتاب نہیں ہے۔ یہ خدا کی میزان ہے جو اِس لیے نازل کی گئی ہے کہ دین کے معاملے میں تمام حق و باطل کا فیصلہ اِسی پر تول کر کیا جائے۔ مسلمان اپنے تمام اختلافات اِس کے سامنے پیش کریں اور جو فیصلہ اِس کی بارگاہ سے صادر ہو جائے، بے چون و چرا اُسے قبول کر لیں۔ یہ اُن کے علم و عمل کا مرکز ہو۔ ایمان و عقیدہ اور دین و شریعت کے تمام معاملات میں یہی مرجع بنے، ہر تحقیق، ہر راے اور ہر نقطۂ نظر کو ہمیشہ اِس کے تابع رکھا جائے، یہاں تک کہ خدا کے پیغمبروں کی کوئی بات بھی اِس پر حکم نہ سمجھی جائے، بلکہ ہر چیز پر اِسی کو حکم مانا جائے۔ گذشتہ کئی صدیوں سے مسلمان بدقسمتی سے کتاب الٰہی کی یہ حیثیت اپنے علم و عمل میں برقرار نہیں رکھ سکے۔ چنانچہ اقبال کے الفاظ میں 'خوار از مہجوریِ قرآں شدی'* کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں۔

ثانیاً، دنیا عالم اسباب ہے۔ یہ اسباب زیادہ تر سائنسی علوم میں انسان کی مہارت سے پیدا ہوتے ہیں۔ خدا نے اپنے جو خزانے زمین و آسمان میں مدفون رکھے ہوئے ہیں، وہ اِسی مہارت سے نکالے جا سکتے ہیں۔ انسان کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ عروج و زوال تو ایک طرف، اُس کے مرنے اور جینے کا انحصار بھی بیش تر اِنھی علوم میں مہارت پر رہا ہے۔ آگ کی دریافت اور پہیے کی ایجاد سے لے کر دور جدید کے حیرت انگیز انکشافات تک یہ حقیقت تاریخ کے ہر صفحے پر ثبت ہے۔ مسلمانوں کو اِن علوم سے دل چسپی تو ہوئی، مگر اُن کے ذہین عناصر کا اشتغال زیادہ تر فلسفہ اور تصوف سے رہا، حالاں کہ اِس کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ فلسفہ و تصوف جن سوالات سے بحث کرتے ہیں، خدا کی کتاب حتمی حجت کی حیثیت سے اُن کا جواب لے کر نازل ہو چکی تھی۔ اِن علوم کے ساتھ اشتغال نے مسلمانوں کو خدا کی کتاب سے بھی بے گانہ رکھا اور سائنسی علوم سے بھی۔ پرانے مدرسوں میں وہ اب بھی فلسفہ و تصوف کے وہی مباحث دہرا رہے ہیں جو 'علم لا ینفع'** کی بہترین مثال ہیں۔ چنانچہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور وہ تصویر حیرت بنے ہوئے ہیں۔

ثالثاً، مسلمانوں نے اپنی اخلاقی تربیت سے شدید غفلت برتی ہے۔ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ جھوٹ، بددیانتی، غبن، خیانت، چوری، غصب، ملاوٹ، سود خوری، ناپ تول میں کمی، بہتان طرازی، وعدے کی خلاف ورزی، سفلی علوم سے اشتغال، ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق، قبروں کی پرستش، مشرکانہ رسوم، بے ہودہ تفریحات اور اِس نوعیت کے

---

* تم قرآن کو چھوڑ کر خوار ہوئے ہو۔

** وہ علم جو نفع نہ دے۔

دوسرے جرائم اُن کے معاشروں میں اِس قدر عام ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کے یہی جرائم تھے جن کی بنا پر خدا کے نبیوں نے اُن پر لعنت کی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے خدا کی رحمت سے دور کر دیے گئے۔ مسلمان بھی اِسی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ اُن کی تصویر دیکھنا ہو تو انجیل کے صفحات میں دیکھ لی جا سکتی ہے، جہاں سیدنا مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل اور اُن کے علما و احبار، دانش وروں اور ارباب حل وعقد کی فرد قرارداد جرم بیان کی ہے۔ اُن کے در و دیوار، گلیاں اور بازار، سب پکارتے ہیں ـــــ یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود۔

مسلمانوں کا زوال اِن اسباب سے ہوا ہے۔ وہ انحطاط و زوال کی اِس حالت سے نکلنا چاہتے ہیں تو نہ جہاد و قتال سے کچھ ہو سکتا ہے، نہ مزاحمت کی تحریکوں سے۔ سرنگا پٹم سے افغانستان تک پچھلے دو سو سال کی تاریخ اِس کی گواہی دیتی ہے۔ اِس سے نکلنے کے لیے اُنھیں وہ اسباب دور کرنا ہوں گے جو اُن کے زوال کا باعث بنے ہیں، ورنہ یہی ذلت و نکبت اور محکومی ہمیشہ اُن کا مقدر رہے گی۔ خدا کا قانون بے لاگ ہے۔ وہ اُس کی زد میں آ چکے ہیں۔ وہ جب دوسروں سے لڑ کر اِس سے نکلنا چاہتے ہیں تو درحقیقت خدا سے لڑ رہے ہوتے ہیں جس نے اپنے 'اولی باس شدید' بندے اُن پر مسلط کر دیے ہیں۔ یہ خدا کا عذاب ہے۔ اِس سے بچنے کے راستے وہ نہیں ہیں جو اُن کے مذہبی اور سیاسی رہنما اور بزعم خود مجاہدین اُنھیں بتا رہے ہیں۔ اِن راستوں پر چل کر نہ وہ بڑی طاقتوں کا اثر و رسوخ اپنے ملکوں میں ختم کر سکتے ہیں، نہ فلسطین اور کشمیر سے یہود و ہنود کو نکال سکتے ہیں۔ وہ قرآن اور بائیبل، دونوں میں انبیا علیہم السلام کی دعوت کا مطالعہ کریں۔ خدا کے پیغمبر بابل کی اسیری کے زمانے میں آئے ہوں یا رومی حکمرانوں کے دور میں، اُنھوں نے کبھی یہ راستے اپنی قوم کو نہیں بتائے۔ وہ اپنی قوم کے جرائم اُسے بتاتے تھے، یہ دوسروں کے جرائم ڈھونڈنے اور اُنھیں بُرا بھلا سنانے کو اپنا ہنر سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اُسے ابتدا سے انتہا تک دیکھ لیجیے۔ بابل اور روم کے حکمرانوں کے خلاف آپ مذمت کا ایک لفظ اُس میں نہیں دیکھیں گے، بلکہ ہر جگہ بنی اسرائیل کی فرد قرارداد جرم دیکھیں گے۔ یہی فرد جرم اِس وقت مسلمانوں کو بھی سنانے کی ضرورت ہے، اِس لیے کہ خدا کا جو وعدہ بنی اسرائیل سے تھا، وہی مسلمانوں سے ہے کہ تم میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے ساتھ اپنے عہد کو پورا کروں گا۔ میری رحمت منتظر ہے، لیکن اِنھی راستوں پر چلتے رہو گے تو میں بھی اُسی راستے پر چلوں گا جس پر چل رہا ہوں اور میرے عذاب کا تازیانہ تمھاری پیٹھ پر برستا رہے گا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

(۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

قُلْ اِنِّیْ نُھِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ، قُلْ: لَّآ اَتَّبِعُ اَھْوَآءَ کُمْ، قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا، وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾ قُلْ: اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ، وَ کَذَّبْتُمْ

(اے پیغمبر)، کہہ دو[۶۸] کہ مجھے تو اُن کی عبادت سے روکا گیا ہے جنھیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔[۶۹] کہہ دو: میں تمھاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چل سکتا۔[۷۰] اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہی میں پڑا اور راستہ پانے والوں میں سے نہیں رہا۔ کہہ دو: میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل[۷۱] پر ہوں اور تم نے

۶۸؎ یہ لفظ اِس آیت میں بھی ہے اور آگے کی آیتوں میں بھی بار بار آیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں اُن شبہات و اعتراضات کے جواب میں کہی گئی ہیں جو مخاطبین کی طرف سے پیش کیے جا رہے تھے۔

۶۹؎ یعنی دعا و استرحام کے لیے پکارتے ہو۔ یہ اُسی بات کو منفی پہلو سے دہرایا ہے جو پیچھے بیان ہوئی ہے کہ خدا کی شہادت جو قرآن کی صورت میں مجھ پر نازل ہوئی ہے، وہ تو یہی ہے کہ زمین و آسمان کا پروردگار وحدہ لاشریک ہے۔

۷۰؎ اصل میں لفظ 'اَھْوَآء' آیا ہے۔ اِس سے مراد مشرکانہ بدعات ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...'اَھْوَآء' کے لفظ سے تعبیر کر کے قرآن نے اِن کے بے بنیاد ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ اِن کے شریک خدا ہونے کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے، نہ خدا کے کلام و الہام میں، محض اپنے جی سے تم نے یہ چیزیں

بِہٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَھُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ: لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَآ اِلَّا ھُوَ، وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ، وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعْلَمُھَا، وَلَا حَبَّۃٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵۹﴾

اُسے جھٹلا دیا ہے۔[۲] تم جس چیز کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہو، وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اُس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی حق کو واضح فرمائے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ جس چیز کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، اگر وہ میرے ہاتھ میں ہوتی تو میرے اور تمھارے درمیان اِس معاملے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ (یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے) اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ غیب کی کنجیاں[۳] اُسی کے پاس ہیں، اُنھیں اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے، اُس کے علم میں ہے۔ درخت سے کوئی ایسا پتا اور زمین کی تہوں میں کوئی ایسا دانہ بھی نہیں گرتا اور نہ کوئی

گھڑی ہیں اور چونکہ اِن کی موہوم شفاعت کی امید نے تمھیں ایمان و عمل اور فکر آخرت کی تمام ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے، اِس وجہ سے یہ تمھارے نفس کو بہت پسند ہیں۔ بہرحال تمھیں پسند ہیں تو ہوں، لیکن حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں حقیقت کو نظر انداز کر کے تمھاری جھوٹی آرزوؤں، باطل خواہشوں اور بے سند بدعات کی پیروی کروں۔'' (تدبرقرآن ۳/۶۶)

۱؎ یعنی قرآن مجید جو توحید کی حقیقت کو ہر لحاظ سے واضح کر دیتا ہے۔

۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَ کَذَّبْتُمْ بِہٖ'۔ اِن میں ضمیر کا مرجع لفظ 'بَیِّنَۃ' ہے جس کا ترجمہ ہم نے روشن دلیل کے الفاظ سے کیا ہے۔ اِس کے لیے ضمیر مونث آنی چاہیے تھی، لیکن یہ لفظ کے بجاے مفہوم و مصداق کے لحاظ سے آگئی ہے۔ اِس کا فائدہ یہ ہے کہ اِس سے قرآن کا ایک قطعی حجت اور واضح شہادت ہونا بھی واضح ہوا اور یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ 'بَیِّنَۃ' سے مراد قرآن ہی ہے۔

۳؎ یعنی وہ کنجیاں جن سے تمام غیب کے دروازے کھل جائیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ
لِیُقْضٰٓی اَجَلٌ مُّسَمًّی، ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ، ثُمَّ یُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَهُوَ
الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَةً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ
تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا، وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ، اَلَا لَهُ
الْحُکْمُ، وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ﴿۶۲﴾

خشک و تر ایسا ہے جسے وہ نہ جانتا ہو۔ یہ سب (اُس کے ہاں) ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔[۴] ۵۶-۵۹

وہی ہے جو رات میں تمھاری روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ دن میں کرتے ہو، اُسے بھی جانتا ہے۔ پھر اُسی میں تمھیں اٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری کی جائے۔ آخر کار تمھیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ کرتے رہے ہو۔ وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور تم پر (اپنے) نگران مقرر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ہی اُس کی روح قبض کرتے ہیں اور (اِس کام میں) کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر سب کے سب اپنے حقیقی مولا کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں۔ سنو، فیصلے کا سارا اختیار اُسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ بہت تیزی کے ساتھ حساب چکانے والا ہے۔[۵] ۶۰-۶۲

۴؎ اوپر والے مضمون کی تقریب سے یہ علم الٰہی کی وسعت اور اُس کے احاطہ کو بیان فرمایا ہے جس سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ خدا صرف کلیات ہی کا نہیں، بلکہ جزئیات کا بھی عالم ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اللہ تعالیٰ کے علم کی اِس وسعت کا اعتقاد ہی ہے جو اہل ایمان کے اندر کامل تفویض، کامل اعتماد اور کامل رضا بالقضا کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اِس میں معمولی غلط فہمی بھی شرک کی راہیں کھول دیتی ہے۔ یہی چیز آخرت پر سچے اور پکے ایمان کی بنیاد ہے اور اِسی کے صحیح تصور و تذکر سے انسان کے اندر وہ خشیت بھی پیدا ہوتی ہے جو زندگی میں اُس کو صحیح روش اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۶۸)

۵؎ بعث و نشر اور جزا و سزا کے بارے میں لوگوں کے مغالطے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ علم الٰہی کا صحیح تصور نہیں رکھتے۔ اوپر کی آیتوں میں اُس کی وضاحت فرمائی تو موقع پیدا ہو گیا کہ موت کے بعد زندگی اور حساب کتاب کی

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلِ: اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ، ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾ قُلْ: هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ، اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾

اِن سے پوچھو کہ بحرو بر (میں آفات و مصائب) کی تاریکیوں سے کون تمھیں بچاتا ہے، جبکہ تم گڑگڑا کراور چپکے چپکے اُسے پکار رہے ہوتے ہو[۶] کہ اگراُس نے اِس مصیبت سے ہمیں بچالیا تو ہم اُس کے شکرگزار بندے بن کر رہیں گے؟ کہہ دو: اِس سے اور ہر مصیبت سے اللہ ہی تمھیں نجات دیتا ہے، لیکن اِس کے بعد پھر شرک کرنے لگتے ہو۔ کہہ دو: وہ پوری قدرت رکھتا ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے برپا کردے یا تمھیں گروہ در گروہ کرکے گتھم گتھا کرے اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کررہے ہیں تاکہ وہ سمجھ لیں۔ ۶۳-۶۵

یاددہانی کردی جائے۔ اِس کے لیے اُس تمثیلی مشاہدے کا حوالہ دیا ہے جو ہم میں سے ہر شخص کو ہر روز کرایا جارہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...قرآن نے یہاں ہر شب میں سونے کو 'وفات' سے اور ہر صبح کے اٹھنے کو 'بعث' سے تعبیر کرکے توجہ دلائی ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو ہر روز ہورہا ہے، جس طرح تمھارا سونا اور جاگنا ہے، اُسی طرح تمھارا مرنا اور اٹھنا ہے اور جس طرح تم میں سے کسی سونے والے کے دن کے اعمال سے خدا لاعلم نہیں ہوتا، اُسی طرح جب تم موت کی نیند سوؤ گے تو خدا تمھاری زندگی کے اعمال بھول نہیں جائے گا اور جس طرح تمھاری ہر شب کی نیند کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھتے ہو، اُسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی اور تم ایسا محسوس کروگے کہ یہ جو کچھ ہوا، سب صبح و شام کا قصہ ہے۔“ (تدبر قرآن ۶۹/۳)

۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً'۔ 'تَدْعُوْنَ' 'يُنَجِّيْكُمْ' کی ضمیر مفعول سے حال واقع ہوا

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ، وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾

تمھاری قوم نے (اے پیغمبر، ہماری اِس وعید کو) جھٹلا دیا ہے، دراں حالیکہ یہ بالکل حقیقت ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ میں تمھارے اوپر کوئی داروغہ نہیں بنایا گیا ہوں (کہ تمھیں ضرور ہی سمجھا دوں)۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ (اِس کے باوجود عذاب ہی مانگتے ہو تو) عنقریب یہ حقیقت تمھیں بھی معلوم ہو جائے گی۔ ٦٦-٦٧

ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

٧٧؎ یہ اُن حقائق کی طرف متوجہ فرمایا ہے جو خدا کی توحید سے متعلق خود انسان کے اندر موجود ہیں۔

[باقی]

www.ghamidi.net

طالب محسن

تکبر کا انجام

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہِ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ. قَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ یُحِبُّ أَنْ یَّکُوْنَ ثَوْبُہُ حَسَنًا وَنَعْلُہُ حَسَنَۃً. قَالَ: إِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ. الْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو گا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو گا۔ ایک آدمی نے پوچھا: آدمی اچھے کپڑے اور اچھے جوتے پسند کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر حق کا انکار اور لوگوں کی تحقیر ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا یَدْخُلُ النَّارَ أَحَدٌ فِیْ قَلْبِہِ مِثْقَالُ حَبَّۃِ خَرْدَلٍ مِّنْ إِیْمَانٍ. وَلَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ أَحَدٌ فِیْ قَلْبِہِ مِثْقَالُ حَبَّۃِ خَرْدَلٍ مِّنْ کِبْرِیَاءَ.

حضرت عبداللہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جہنم میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے، اور وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ.

حضرت عبداللہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہے۔

www.ghamidi.net

لغوی مباحث

'لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ': مراد ہے: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس نے.... اس طرح کے عمومی اسلوب کی متعدد مثالیں احادیث میں موجود ہیں۔ اس طرح کے اسلوب کو حتمی یا کلی معنی میں لینا درست نہیں ہے۔ یہ اسلوب شدت کے ساتھ متوجہ کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید سے واضح ہے کہ وہی تکبر باعث جہنم ہے جو حق کے انکار تک لے جانے کا باعث ہو۔

'بَطَرُ الْحَقِّ': 'بَطَرُ الْحَقِّ' سے مراد حق کی تضحیک اور اس کا ابطال ہے۔

'غَمْطُ النَّاسِ': 'غَمْطُ النَّاسِ' کا مطلب لوگوں کو حقیر یا کم تر سمجھنا ہے۔

'مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِّنْ إِيْمَانٍ': 'خردل' ایک سیاہ دانہ ہے جو بہت باریک ہوتا ہے۔ 'مثقال' کا لفظ مقدار بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس دانے کے برابر مقدار مراد ہے۔ یہ کسی شے کی قلیل ترین مقدار کو بیان کرنے کا ایک اسلوب ہے۔

'إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ': 'اللہ خوب صورت ہے'۔ شارحین نے یہ بحث کی ہے کہ اللہ کے خوب صورت ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا صفات حسن و کمال سے متصف ہونا مراد ہے یا اللہ تعالیٰ کا انسانوں کے ساتھ لطف و عنایات سے پیش آنا مراد ہے؟ روایت کے دروبست ہی سے واضح ہے کہ یہاں پہلا پہلو مراد ہے۔

معنی

اس روایت میں دو باتیں بیان ہوئی ہیں: ایک تکبر کا انجام اور دوسرے یہ تصریح کہ اچھا لباس پہننے میں تکبر نہیں ہے، بلکہ تکبر حق کے انکار اور لوگوں کی تحقیر میں ہے۔ تکبر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی ذرہ برابر مقدار بھی آدمی کو جنت کا مستحق نہیں رہنے دیتی۔ سورۂ اعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ. (۷:۴۰)

’’بے شک جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور تکبر کی وجہ سے ان سے گریز کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔‘‘

www.ghamidi.net

اس آیت سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ متکبر کو جنت سے محرومی کی وعید کس وجہ سے دی جاتی ہے، یعنی جب تکبر تکذیب آیات پر منتج ہو۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حق سے گریز وانکار میں تکبر کو ایک بڑے محرک کی حیثیت حاصل ہے۔ تکبر اپنی اصل میں احساس برتری کا نام ہے، لیکن یہ مرض کی صورت اس وقت اختیار کر جاتا ہے، جب دوسرے انسان حقیر نظر آنے لگیں اور حق کا اثبات آدمی کو اپنی انا توڑنے کے مترادف لگنے لگے۔ قرآن مجید میں تکبر کا یہ پہلو کئی مواقع پر زیر بحث آیا ہے۔ ابلیس کا سجدہ کرنے سے انکار کا معاملہ بھی تکبر ہی کی وجہ سے پیش آیا۔ وہ انسان کے مقابلے میں اپنی برتری کے ایسے احساس میں مبتلا ہوا کہ کائنات کے مالک کا حکم نہ ماننے پر تل گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تکبر کا جو پہلو جنت سے محرومی پر منتج ہوتا ہے، وہ اس کا کفر تک لے جانا ہے۔ تکبر حقیقت میں دل کا مرض ہے۔ یہ اپنے بہتر یا بڑے ہونے کے تصور سے پیدا ہوتا اور بدرجۂ آخر دوسروں کی تحقیر اور حق قبول کرنے کی استعداد سے محرومی پر لے جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حق کو قبول کرنا بندگی کو قبول کرنا ہے اور بندگی تکبر کی بالکل ضد ہے۔ بندگی اپنے محتاج ہونے کا اقرار ہے۔ بندگی خدا کی کبریائی کا اقرار ہے۔ بندگی سر جھکانے کا نام ہے۔ بندگی اعتراف خطا کا نام ہے۔ یہ سارے عمل تکبر کی صورت میں نہیں ہو سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ متکبر خدا کی آیات کی تکذیب کرے گا۔ وہ عبادت سے گریزاں رہے گا۔ وہ اپنی انا کی وجہ سے دوسروں کے لیے باعث آزار بنا رہے گا۔ یہ سارے جرائم جنت سے دور لے جانے والے جرائم ہیں۔ یہ بات کہ ذرہ برابر تکبر بھی جنت سے محرومی کا سبب بنے گا، نتیجے کے اعتبار سے کہی گئی ہے اور پیش نظر تنبیہ ہے۔ اگر کوئی شخص جہنم سے بچنا چاہتا ہے تو اسے اپنے آپ کو تکبر سے بچانا ہے۔ تکبر

کا شائبہ بھی اگر اس کا علاج بروقت نہ ہو تو تکبر کے ان نتائج تک لے جائے گا جن سے ان روایات میں خبردار کیا گیا ہے۔

متکبر کے جنت میں نہ جانے کی وعید کی نوعیت ہمارے نزدیک یہی ہے، لیکن شارحین نے اس اشکال کو دو طرح سے حل کیا ہے: ایک یہ کہ تکبر والے لوگ تکبر کی صفائی کر کے جنت میں داخل کیے جائیں گے اور اس حوالے سے وہ قرآن مجید کی آیت 'وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ'، 'اور ان کے سینے کی ہر خلش ہم کھینچ لیں گے' (الاعراف ۷:۴۳) سے استدلال بھی کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ صاحب تکبر بعد میں جنت میں جائے گا۔ ہم نے اس روایت کو تنبیہ اور انذار کے معنی میں لیا ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطرے کی نشان دہی کی ہے جو ذرہ برابر بھی تکبر کی موجودگی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں تکبر کی جو توضیح کی ہے، اس سے واضح ہے کہ یہ تکبر کا آخری درجہ ہے۔ ہر آدمی کے اندر اپنے بارے میں اچھی رائے ہوتی ہے، لیکن یہ اچھی رائے آگے بڑھ کر انا اور تکبر کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ جب لوگ حقیر لگنے لگیں اور حق کو قبول کرنے میں انا آڑے آنے لگے۔ ظاہر ہے اس طرح کا متکبر ان جرائم کا مرتکب ہونے سے بچ نہیں سکتا جو جہنم میں لے جانے کا باعث ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ یہ دونوں چیزیں تکبر کی گھناؤنی حالت کی علامت بھی ہیں اور نتیجہ بھی۔

تکبر کے حوالے سے ایک سوال بھی اس روایت میں بیان ہوا ہے۔ یہ سوال حضور سے بھی کیا گیا اور آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ کیا اچھا لباس، اچھی خوراک، اچھی رہایش بھی تکبر ہی کا اظہار ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب نفی میں دیا ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں بڑی وضاحت سے زیر بحث آئی ہے۔ سورۂ اعراف ہی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ. (الاعراف ۷:۳۲)

''کہہ دو: اللہ کی زینت کس نے حرام ٹھیرائی ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے، اور پاکیزہ رزق بھی۔ کہہ دو: یہ (نعمتیں) دنیوی زندگی میں اہل ایمان کے لیے ہی ہیں، اور قیامت کے روز صرف انھی کے لیے ہوں گی۔ ہم جاننے والوں کے لیے اسی طرح آیات کو واضح کرتے ہیں۔''

اس آیت میں اہل ایمان کے لیے نعمتوں اور زینتوں سے لطف اندوز ہونے کو جس زور اور شان سے بیان کیا گیا

ہے، اس سے ان تمام نظریات کی نفی ہو جاتی ہے جو ترک لذات کو دین داری کی معراج قرار دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں جس چیز کی مذمت ہوئی ہے، وہ دنیا پرستی ہے۔ بطن وفرج کی غلامی ہے۔ دین کے تقاضوں کے مقابلے میں دنیوی مفادات کو ترجیح دینا ہے۔ اچھا لباس پہننا اور چیز ہے اور اچھے لباس ہی کو اپنی ساری تگ ودو کا ہدف بنا لینا اور چیز۔ پہلی چیز محمود ہے اور دوسری مذموم۔

اس روایت میں اللہ تعالیٰ کی طرف صفت جمال کی نسبت کی گئی ہے۔ شارحین نے اس نسبت دینے کو بھی موضوع بنایا ہے اور اس کے معنی پر بھی کلام کیا ہے۔ سوال یہ زیر بحث ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی صفت کی نسبت کی جا سکتی ہے جو قرآن میں بیان نہ ہوئی ہو۔ ہمارے نزدیک اس باب میں شارحین کی وہی وضاحت درست ہے جو انھوں نے سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۸۰ 'لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى' (تمام اچھے نام اللہ کے ہیں) کی روشنی میں کی ہے۔ 'تمام اچھے نام اللہ کے ہیں' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام صفات کمال سے متصف ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہر اس صفت کی نسبت درست ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کاملیت کو ظاہر کرتی ہے۔

دوسرا زیر بحث پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صاحب جمال ہونے سے کیا مراد ہے؟ کچھ شارحین نے اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ رحمت وکرم کے برتاؤ کا پہلو مراد لیا ہے، لیکن اس روایت میں جس چیز پر استشہاد کیا گیا ہے، اس سے اس معنی کی مناسبت نہیں ہے۔ چنانچہ شارحین نے بالعموم اس معنی کو قبول نہیں کیا ہے۔ دوسرے معنی یہ کیے گئے ہیں کہ جمیل یہاں مجمل کے معنی میں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اشیا کو حسن بخشتے ہیں۔ یہ معنی بھی کھینچ تان کر ہی پیدا کیے گئے ہیں کہ لفظ جمیل کے معروف معنی کسی شے کے خود خوب صورت ہونے ہی کے ہیں۔ کسی بھی فعل یا صفت کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت اس میں خصوصی معنی پیدا کر دیتی ہے۔ شارحین کی مشکل یہ ہے کہ ذات باری کے بارے میں کوئی بات کیسے کہی جا سکتی ہے۔ یہ بات درست ہے، مگر وہ ذات جس نے اس کائنات کو جس طرح حسن بخشا ہے، یہ حسن خود اس کے صاحب جمال ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں ہی سے سمجھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے دونوں باتوں پر روشنی پڑتی ہے، اس پر بھی کہ وہ کیا پسند کرتا ہے اور اس پر بھی کہ وہ خود کیسا ہوگا۔

اوپر روایت میں ذرہ برابر ایمان کو بھی یقینی نجات کا ضامن قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے تقابل میں محل نظر دکھائی دیتی ہے، اس لیے کہ قرآن مجید اصرار کے ساتھ ایمان اور عمل صالح بہ یک وقت دونوں کو یقینی نجات کے لیے شرط ٹھیراتا ہے۔ قرآن مجید کی روشنی میں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وضاحت اس طرح کریں گے کہ

اس میں ایمان سے مراد وہ ایمان ہے جو محض قول کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ایک حقیقی فیصلے کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ اعمال صالح ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب اس ایمان کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے جو بعد میں نسلی مسلمانوں میں اب ظاہر ہوا ہے کہ یہ محض نام کے مسلمان ہیں، ان کے اعمال پر اس اسلام کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔

متون

زیر بحث روایت کے تین متن امام مسلم نے اپنی کتاب کے لیے منتخب کیے ہیں: ایک متن میں ذرہ برابر تکبر کا انجام بیان ہوا ہے۔ دوسرے متن میں ذرہ برابر ایمان کا اجر بیان ہوا ہے۔ تیسرے متن میں دونوں جمع ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ایک متن میں تکبر کی توضیح بھی ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت جمال کے حوالے سے حسن وخوبی کو پسندیدہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ کتب روایت میں اس روایت کے یہی متون الفاظ کے فرق کے ساتھ روایت کیے گئے ہیں۔ ایک اعتبار سے دیکھیں تو امام مسلم نے اختلاف متن کے تمام پہلو جمع کر دیے ہیں۔ باقی کتب روایت میں ایسا کوئی فرق روایت نہیں ہوا جو روایت کے معنی پر اثر انداز ہوتا ہو یا اس کے کسی پہلو کو سمجھنے میں مددگار ہو۔

بعض روایات میں انجام بیان کرنے کے لیے 'أکبه اللّٰه علی وجهه فی النار' یا 'ما من رجل... تحل له الجنة أن یریح ریحها و لا یراها' کی تعبیرات اختیار کی گئی ہیں۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نوح علیہ السلام کی اپنے بیٹے کو وصیت کا ذکر کیا تھا جس میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو یہ بات بھی بتائی تھی۔

آدمی کی پسند کا ذکر بالعموم اسی انداز میں ہوا ہے، جس طرح امام مسلم کی روایت میں درج ہے، لیکن بعض روایات میں ذرا تفصیلی انداز بیان بھی منقول ہے۔ ایک روایت میں مثال کے طور پر یہ بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: 'إنی لیعجبنی أن یکون ثوبی غسیلاً، ورأسی دهینًا، وشراك نعلی جدیدًا، وذکر أشیاء حتی ذکر علاقة سوطه'۔ ایک اور روایت میں اسی بات کے لیے یہ مثالیں بیان کی گئی ہیں: 'إنی أحب أن أتجمل بنقاء ثوبی، وبطیب طعامی، وبحسن مرکبی'۔

تکبر کی وضاحت میں امام مسلم کی روایت میں 'بطر الحق' اور 'غمط الناس' کی تعبیرات اختیار کی گئی ہیں۔ دوسری روایت میں 'بطر' کے لیے 'سفه' کا لفظ آیا ہے۔ اسی طرح 'غمط' کی جگہ اسی کا مترادف 'غمص' یا 'ازدراء' آیا ہے۔ بعض روایات میں یہ تصریح بھی آئی ہے کہ وہ شخص متکبر نہیں ہو سکتا جو غریبوں کے ساتھ بیٹھ جاتا ہو۔ گدھے

www.ghamidi.net

پر سواری کر لیتا ہو اور بکری کا دودھ پی لیتا ہو۔

کتابیات

مسلم، رقم ۹۱؛ ترمذی، رقم ۱۹۹۸، ۱۹۹۹؛ ابوداؤد، رقم ۴۰۹۱؛ ابن ماجہ، رقم ۵۹، ۴۱۷۳؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۶۵۷۸، ۲۶۵۸۰، ۲۶۵۸۱؛ احمد، رقم ۳۷۸۹، ۳۹۱۳، ۳۹۴۷، ۴۳۱۰، ۶۵۲۶، ۷۰۱۵، ۱۷۴۰۷؛ مسند عبد بن حمید، رقم ۱۱۵۱؛ التواضع والخمول، رقم ۱۹۲، ۱۹۶، ۲۱۸؛ الآحاد والمثانی، رقم ۲۸۲۱؛ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۵۰۱۳، ۵۰۶۵، ۵۰۶۶، ۵۲۸۹، ۵۳۳۰؛ ابن حبان، رقم ۲۲۴، ۵۴۶۶، ۵۶۸۰؛ مسند شامیین، رقم ۶۲، ۷۴۵؛ المعجم الکبیر، رقم ۶۶۶۸، ۱۰۰۰۰، ۱۰۰۶۶، ۱۰۵۳۳؛ مستدرک، رقم ۶۹، ۵۷۵۷۔

www.ghamidi.net

عمار خان ناصر

جماعت صحابہ کی خصوصی حیثیت

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.ghamidi.net

گزشتہ باب میں روم وفارس اور جزیرۂ عرب سے متصل دوسری سلطنتوں کے خلاف صحابہ کے جہاد کے حوالے سے جو گفتگو کی گئی ہے، اس سے اگرچہ اصولی طور پر ان اقدامات کی حقیقی نوعیت واضح ہو جاتی ہے، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس بحث کے چند اہم نکات پر نسبتاً تفصیل سے روشنی ڈالی جائے تاکہ صحابہ کے جنگی اقدامات کا درست تناظر زیادہ نکھر کر سامنے آ جائے۔ یہ نکات ہمارے نزدیک حسب ذیل ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحابہ کو 'شہادت علی الناس' کے خاص منصب پر فائز کیا گیا اور اسی کے تحت انھیں مذکورہ اقوام کے خلاف قتال کا اختیار دیا گیا تھا۔

دوسرے یہ کہ صحابہ کے جنگی اقدامات کے جغرافیائی اہداف محدود اور متعین تھے اور اس دائرے میں بھی وہ جہاد وقتال کے اس سلسلے کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جانے کے بجائے محدود سے محدود تر رکھنے کے خواہش مند تھے۔

تیسرے یہ کہ قرآن مجید میں 'اظہار دین' کی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا جو ہدف مقرر کیا گیا تھا، وہ جزیرۂ عرب اور اس کے بعد روم وفارس کے علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانے سے آخری حد تک مکمل ہو گیا اور اس پیش گوئی کا کوئی جزو تاریخی طور پر تشنۂ تکمیل نہیں رہا۔

ذیل میں ہم ان نکات کی وضاحت کریں گے:

شہادت علی الناس

'شہادت علی الناس' کے منصب کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ عالم کا پروردگار کسی خاص گروہ سے اپنی وفاداری اور اطاعت کا عہد و پیمان لے کر اسے دین و شریعت کی نعمت سے نوازتا، آزمایش اور ابتلا کے مختلف مراحل سے گزار کر اس کے تزکیہ و تربیت کا اہتمام کرتا اور اس امتحان میں کامیابی پر اسے دنیوی حکومت و اقتدار سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔ یہ گروہ اپنے اجتماعی وجود کے لحاظ سے یوں سراپا حق اور مجسم عدل و انصاف ہوتا اور اپنی دعوت اور کردار کے ذریعے سے حق کی اس طرح عملی شہادت بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں کفر و طغیان کا رویہ اپنانے والی قوموں کو سزا دینے کا اختیار دے دیتا ہے۔ 'شہادت' کے منصب پر فائز گروہ کے لیے اس اختیار اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی فتوحات کی حیثیت اللہ کے انعام کی ہوتی ہے اور اسے یہ حق دے دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی سرزمین میں اس کے میسر کردہ نعمتوں اور وسائل کو اپنے تصرف میں لے آئے، جبکہ مفتوح و مغلوب قوموں کے لیے یہی عمل اللہ کی طرف سزا اور انتقام قرار پاتا ہے۔

قرآن مجید اور انبیاے بنی اسرائیل کے صحائف سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے بعد نبوت و رسالت کو ان کی اولاد کے ساتھ مخصوص فرما کر انھیں دنیا کی قوموں پر فضیلت بخشی اور من حیث القوم، اقوام عالم پر حجت تمام کرنے کے لیے منتخب کر لیا۔ ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ اللّٰـهَ اصْطَفَى آدَمَ وَنُوحاً وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ۔ (آل عمران ۳: ۳۳)	''بے شک اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو دنیا والوں پر ترجیح دے کر منتخب کر لیا۔''

آل ابراہیم کی تاریخ کے دور اول میں اس منصب کے حامل بنی اسرائیل تھے جبکہ آخری دور میں یہ ذمہ داری بنی اسماعیل کو سونپی گئی۔ بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا:

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُواْ نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ۔ (البقرہ ۲: ۴۷)	''اے بنی اسرائیل، میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور اس بات کو بھی کہ میں نے جہان والوں پر تمھیں فضیلت بخشی۔''

سورۂ مائدہ میں ہے:

www.ghamidi.net

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُواْ نِعْمَةَ اللّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاء وَجَعَلَكُم مُّلُوكاً وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَداً مِّن الْعَالَمِينَ ۔ (المائدہ۵: ۲۰)

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد رکھو کہ اس نے تمھارے اندر نبی بھیجے اور تمھیں بادشاہ بنایا اور تمھیں وہ کچھ دیا جو جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیا۔''

بنی اسرائیل کے بعد، بنی اسماعیل کے اس منصب پر فائز کیے جانے کا ذکر بھی قرآن نے جگہ جگہ مختلف الفاظ اور اسالیب میں کیا ہے۔ سورۂ حج میں فرمایا:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ (الحج ۲۲: ۷۸)

''اور اللہ کے راستے میں اس طرح جدوجہد کرو جیسے جدوجہد کرنے کا حق ہے۔ اسی نے تمھیں چن لیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالی۔ اپنے باپ ابراہیم کے دین کے پیروکار بن جاؤ۔ اسی نے اس سے پہلے بھی اور اس زمانے میں بھی تمھیں 'مسلم' کا لقب دیا۔ اللہ نے تمھیں چن لیا ہے تاکہ رسول تو تم پر حق کی گواہی دیں اور تم اقوام عالم پر اس کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ پس نماز قائم کرتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کے سہارے کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ وہی تمھارا آقا ہے اور کیا ہی اچھا آقا اور کیسا بہترین مددگار ہے۔''

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً ۔ (البقرہ۲: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمھیں درمیان کا ایک گروہ بنایا تاکہ تم لوگوں پر اس دین کے گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر اس کی گواہی دے۔''

مذکورہ دونوں مقامات کے سیاق وسباق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ 'شہادت علی الناس' کے منصب کا ذکر خاص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے بنی اسماعیل یعنی صحابہ کے تناظر میں ہوا ہے۔

سورۂ بقرہ میں اس کا ذکر ملت ابراہیمی کی ابتدا اور اس کی تاریخ کے آخری دور کے ضمن میں ہوا ہے۔ آیت ۱۲۴ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے منصب امامت کے لیے منتخب کیے جانے کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ابراہیم

واسماعیل علیہما السلام نے کعبہ کی تعمیر کے موقع پر یہ دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں بھی ایک 'امت مسلمہ' پیدا ہو اور ان میں ایک رسول مبعوث کیا جائے جو تلاوت آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کے ذریعے سے ان کا تزکیہ کرے۔ اس کے بعد یہود ونصاریٰ کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ان کی ملت کے پیروکار تھے۔ پھر تحویل قبلہ کے واقعہ کا تذکرہ کر کے یہ حقیقت نمایاں کی گئی ہے کہ دین ابراہیمی میں اصل مرکز اور محور کی حیثیت کعبہ معظّمہ ہی کو حاصل ہے اور یہود کی یہ خواہش کہ یہ حیثیت مسجد اقصیٰ کو دی جائے، بالکل بے بنیاد ہے۔ تحویل قبلہ کے حکم ہی کے ضمن میں منصب 'شہادت' کا ذکر کیا گیا ہے اور صحابہ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ نے ایک درمیانی امت بنایا ہے تاکہ اللہ کا رسول تم پر اور تم لوگوں کے سامنے دین حق کی شہادت دو۔ پھر بیت اللہ کو سفر وحضر میں قبلہ مقرر کرنے کی ہدایات دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سیدنا ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے اپنی ذریت میں جس نبی اور جس امت مسلمہ کے پیدا ہونے کی دعا کی تھی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں کی صورت میں عملاً ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ آیات کے اس سیاق وسباق سے صاف واضح ہے کہ 'شہادت علی الناس' کا منصب خاص طور پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں پیدا ہونے والے اس گروہ کو دیا گیا جس کو ابوالانبیاء نے ''امۃ مسلمۃ'' کا لقب دیا اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث کیے جانے کی دعا کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا مصداق صحابہ کے سوا کوئی دوسری جماعت نہیں ہو سکتی۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

ان النبی صلی الله علیه و سلم بعث فی الامیین الآخذین بالملة الاسماعیلیة وقدر الله فی سابق علمه انهم هم القائمون بنصرة دینه وهم شهداء الله علی الناس من بعده وهم خلفاؤه فی امته ۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ۱/ ۵۵۱، ۵۵۲)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو امیین میں مبعوث کیا گیا جو ملت اسماعیلی کے پیروکار تھے۔ اللہ نے اپنے علم میں پہلے سے ہی طے فرما دیا تھا کہ یہی امیین آپ کے دین کی مدد کے لیے کھڑے ہوں گے، وہی آپ کے بعد لوگوں پر اللہ کے گواہ ہوں گے اور وہی آپ کی امت میں آپ کی خلافت کی ذمہ داری انجام دیں گے۔''

سورۂ حج میں اس آیت پر سورہ کا اختتام ہوا ہے، چنانچہ اس کے صحیح محل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سورۂ حج کا پورا نظم نگاہوں میں ہو۔ اس سورہ کی ابتدائی ۲۳ آیات میں قیامت کے اثبات اور شرک کی تردید پر دلائل دیے گئے ہیں۔ پھر آیت ۲۴ سے ۳۸ تک بیت اللہ کی تعمیر وتاسیس کی تاریخ اور اس کے مقصد تعمیر کی وضاحت کی گئی ہے۔ آیت ۳۹ تا ۴۱ میں مکہ سے نکالے جانے والے مہاجرین کو ظلم کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے اور ان سے

نصرت کا وعدہ کرنے کے ساتھ یہ ذمہ داری ان پر واضح کی گئی ہے کہ جب انھیں سرزمین عرب میں اقتدار مل جائے تو وہ نماز کے قیام، زکوٰۃ کی ادائیگی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کریں گے۔

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۔ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۔ (الحج ۲۲: ۴۱، ۴۲)

''اور اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ بے شک اللہ نہایت قوت والا غالب آنے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو اس سرزمین میں اقتدار دیں گے تو نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ اور معاملات کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔''

اس کے بعد آیت ۴۲ تا ۷۶ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کے مختلف اعتقادی اور عملی رویوں پر تنقید کی گئی اور ان کے طرز عمل کی شناعت واضح کی گئی ہے۔ اسی سلسلہ بیان میں آیت ۵۸ تا ۶۰ میں مہاجرین کو ایک بار پھر فتح ونصرت اور کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ اس ساری بحث کے بعد سورہ کا اختتام ان آیات پر ہوتا ہے جن میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا گیا اور ان پر واضح کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے 'شہداء علی الناس' کے منصب پر فائز ہیں۔

یہاں بھی دیکھ لیجیے، سورہ میں جس گروہ کے احوال، ذمہ داریاں اور جدوجہد زیر بحث ہے اور جن سے نصرت اور فتح کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ بالکل واضح طور پر صحابہ کرام ہی کی جماعت ہے اور سورہ کے اس مربوط نظام میں اختتامیہ کے طور پر وارد ہونے والی ان آیات کی تفسیر کسی بھی طرح سے اس تناظر سے ہٹ کر نہیں کی جا سکتی۔ پھر آیات کے سیاق کے علاوہ خود آیت کے اندر داخلی طور پر دو شہادتیں، یعنی 'اجتبکم' اور 'ملة ابیکم ابراهیم هو سمکم المسلمین' ایسی ہیں جو بالکل قطعی طور پر اس کو ذریت ابراہیم کے ساتھ خاص کر دیتی ہیں۔ قرآن مجید نے خود سورہ بقرہ میں اس اشارے کی تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے اپنی 'ذریت' میں ایک امت کے پیدا ہونے کی دعا کی تھی اور اس کو 'مسلمہ' کا لقب دیا تھا۔ یہ دعا بھی واضح طور پر 'ذریت ابراہیم' کے لیے خاص تھی۔ یہ وہ واضح قرائن ہیں جن کی بنا پر اس آیت کا مصداق صحابہ کرام کے علاوہ کسی اور گروہ کو قرار دینا ممکن نہیں۔ امام ابوبکر الجصاص لکھتے ہیں:

وقوله تعالی (هو اجتباكم) يدل علی انهم عدول مرضيون وفي ذلك بطلان طعن الطاعنين عليهم اذ كان الله لا يجتبي الا اهل طاعته واتباع مرضاته وفي ذلك مدح للصحابة المخاطبين بذلك ودليل علی طهارتهم۔ (احکام القرآن ۳/ ۲۵۱، ۲۵۲)

''اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ 'اس نے تمھیں چن لیا ہے' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک عادل اور پسندیدہ ہیں۔ اس سے ان پر طعن کرنے والوں کا طعن باطل ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ انھی لوگوں کو منتخب کرتا ہے جو اس کے فرماں بردار اور اس کی مرضی پر چلنے والے ہوں۔ نیز اس میں صحابہ کی، جو اس آیت کے مخاطب تھے، توصیف وتعریف اور ان کے پاکیزہ ہونے کی دلیل بھی موجود ہے۔''

مذکورہ آیات کے سیاق وسباق کے علاوہ یہی بات قرآن مجید کے عرف سے بھی واضح ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے کسی طالب علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے مختلف مقامات پر متنوع اسالیب میں جس جماعت کو اللہ تعالیٰ کی منتخب کردہ جماعت قرار دے کر اس کے ایمان وعمل کو نمونہ اور معیار ٹھہرایا گیا ہے، وہ صحابہ ہی کی جماعت ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ۔ (آل عمران ۳: ۱۱۰)

''تم ایک بہترین گروہ ہو جسے لوگوں کی ہدایت کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

یہ آیت جس سلسلہ بیان میں آئی ہے، اس کا آغاز اس بات سے ہوا ہے کہ اے اہل ایمان! اللہ سے کما حقہ ڈرو اور اس کی اس نعمت کو یاد رکھو کہ اس نے تمھاری باہمی دشمنیوں کو ختم کر کے تمھارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے الفت پیدا کی اور تمھیں بھائی بھائی بنا دیا۔ اس کے بعد سابقہ مذہبی گروہوں کے رویے سے گریز کی تلقین کرتے ہوئے زیر بحث آیت میں اہل ایمان پر ان کی ذمہ داری واضح کی گئی ہے اور اس کے بعد اگلی آیت میں ان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مخالف گروہوں پر ہر حال میں غالب رہیں گے:

لَن يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ (آل عمران ۳: ۱۱۱)

''یہ زبانی اذیت کے سوا تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اور اگر تم سے لڑنے آئیں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ پھر انھیں کہیں سے مدد بھی میسر نہیں ہوگی۔''

سیاق اور سباق دونوں سے واضح ہے کہ یہاں مخاطب خاص طور پر صحابہ ہی کی جماعت ہے، اس لیے کہ 'خیر امت' کا لقب دینے سے پہلے دلوں میں الفت ومحبت پیدا کرنے کی جس نعمت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی انھی کو عطا کی گئی تھی

www.ghamidi.net

اوراس کے بعد جس فتح ونصرت کی بشارت دی گئی ہے، وہ بھی انھی کے لیے خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود حضرات صحابہ کرام نے 'خیرامت' کے اعزاز کو اپنے لیے خاص قرار دیا۔ سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں:

لو شاء الله لقال انتم فكنا كلنا ولكن قال كنتم في خاصة من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ومن صنع مثل صنيعهم كانوا خير امة اخرجت للناس يامرون بالمعروف وينهون عن المنكر۔ (تفسیر الطبری، ۴/۴۳)

''اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو یہ فرماتے کہ 'انتم' تا کہ ہم سب اس کا مصداق ٹھہرتے، لیکن اس نے 'کنتم' کہا ہے جس کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ کے مخصوص اصحاب اور وہ لوگ ہیں جو ان کے طریقے پر چلیں۔ رسول اللہ کے یہ اصحاب ہی وہ بہترین جماعت تھے جنھیں لوگوں کی ہدایت کے لیے نکالا گیا اور جو بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے تھے۔''

نیز فرماتے ہیں:

تكون لاولنا ولا تكون لآخرنا ۔ (تفسیر الطبری، ۴/۴۳)

''اس آیت کا مصداق ہمارا اولین گروہ تو ہے لیکن بعد میں آنے والے نہیں۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

هم الذين هاجروا مع محمد صلى الله عليه وسلم الى المدينة ۔ (مسند احمد، رقم ۲۳۳۴)

''یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اصحاب ہیں جنھوں نے آپ کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔''

تابعی مفسر امام ضحاک فرماتے ہیں:

هم اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم خاصة يعني وكانوا هم الرواة الدعاة الذين امر الله المسلمين بطاعتهم۔ (تفسیر الطبری، ۴/۴۴)

''اس سے مراد صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔ وہی اس دین کے راوی اور داعی ہیں جن کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔''

ابن عبدالبر فرماتے ہیں:

وثبت بهم حجة الله تعالى على المسلمين فهم خير القرون وخير امة اخرجت للناس ثبتت عدالة جميعهم

''صحابہ ہی کے ذریعے اللہ کی حجت (بعد کے) مسلمانوں پر ثابت ہوئی، چنانچہ وہی وہ بہترین گروہ ہیں جنھیں لوگوں کے لیے نکالا گیا۔

بثناء الله عزو جل عليهم و ثناء رسوله عليه السلام ۔(الاستیعاب،۱/۱،۲)

ان سب کا عادل ہونا اس تعریف سے ثابت ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان کے حق میں بیان فرمائی ہے۔''

ومعلوم ان مواجهة رسول الله ثم لاصحابه بقوله انتم خيرها اشارة الى التقدمة فى الفضل اليهم على من بعدهم ۔(الاستیعاب،۹/۱)

''واضح ہے کہ 'انتم' کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مخاطب کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کو بعد میں آنے والوں کے مقابلے میں فضیلت حاصل ہے۔''

دوسرے مقامات پر قرآن مجید نے صحابہ ہی کی جماعت کو مخاطب کر کے انھیں سرزمین عرب میں غلبہ اور اقتدار کی بشارت دی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ بنی اسمٰعیل کو ملنے والا حکومت واقتدار دراصل اسی وعدے کا مصداق اور تسلسل ہے جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کی اولاد کے حوالے سے کیا تھا۔ سورۂ نساء میں آل اسماعیل کے خلاف یہود کے حسد اور بغض پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكاً عَظِيماً ۔(النساء۴: ۵۴)

''کیا یہ یہود اللہ کے اس فضل پر جو اس نے ان امیوں کو دیا ہے، ان سے حسد کرتے ہیں؟ تو یقیناً ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت بھی دی ہے اور ہم نے ان کو بہت بڑی سلطنت دینے کا فیصلہ بھی کر رکھا ہے۔''

آیت سے واضح ہے کہ حکومت و بادشاہت کا یہ وعدہ خاص طور پر 'آل ابراہیم' کے ساتھ کیا گیا تھا جس کا مصداق آخری دور میں صحابہ کرام کی جماعت تھی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یعنی کیا یہود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب پر اللہ کے فضل وانعام کو دیکھ کر حسد میں مرے جاتے ہیں۔ سو یہ تو بالکل ان کی بے ہودگی ہے کیونکہ ہم نے حضرت ابراہیم کے گھرانے میں کتاب اور علم اور سلطنت عظیم عنایت کی ہے۔ پھر یہود آپ کی نبوت اور عزت پر کیسے حسد اور انکار کرتے ہیں۔ آپ بھی تو ابراہیم ہی کے گھر میں ہے۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۱۱۳)

سورۂ نور میں زیادہ صریح الفاظ میں ارشاد ہوا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور ان کو

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِيْ لَا يُشْرِكُونَ بِيْ شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ (النور۲۴: ۵۵)

اس سرزمین میں اقتدار دے گا جیسا کہ ان سے پہلے والے گروہ کو دیا تھا، اور ان کے لیے اپنے اس دین کو مستحکم کر دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، اور خوف کی اس حالت کو بدل کر ان کے لیے امن قائم کر دے گا۔ یہ میری عبادت کریں گے اور کسی کو میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کریں گے، سو وہی لوگ بدکار ہوں گے۔“

سیاق وسباق کے علاوہ خود آیت کے اندر ’الذین آمنوا منکم‘ کے الفاظ اس بات پر نص صریح کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اس وعدے کے مخاطب صرف صحابہ کرام ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

واما من حدث فی زمن الفتنة کالرافضة الذین احدثوا فی الاسلام فی زمن الفتنة والافتراق وکالخوارج المارقین فهولاء لم یتناولهم النص فلم یدخلوا فی من وصف بالایمان والعمل الصالح المذکورین فی هذه الآیة لانهم اولا لیسوا من الصحابة المخاطبین بهذا ولم یحصل لهم من الاستخلاف والتمکین والامن بعد الخوف ما حصل للصحابة بل لا یزالون خائفین مقلقلین غیر ممکنین۔
(منہاج السنۃ، ۱/ ۱۵۷)

”وہ گروہ جو فتنے کے زمانے میں پیدا ہوئے، مثلاً رافضی جنھوں نے فتنے اور انتشار کے دور میں اسلام میں بدعات گھڑیں اور خوارج جو دین ہی سے نکل گئے، تو یہ لوگ اس آیت کے دائرے میں نہیں آتے جس میں اس گروہ کے لیے ایمان اور عمل صالح کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ان کا شمار صحابہ میں نہیں ہے جن کو مخاطب کر کے یہ بات کہی گئی تھی اور نہ ان کو اقتدار اور استحکام اور خوف کے بعد امن کی وہ حالتیں حاصل ہوئیں جو صحابہ کو ملی تھیں بلکہ یہ تو ہمیشہ خوف اور بے چینی اور عدم استحکام کی حالت میں رہے۔“

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

”لفظ منکم راجع ست بحاضرین بمسلمین قاطبة زیرا که اگر جمیع مسلمین مراد می بودند بذکر لفظ

”لفظ منکم حاضرین کی طرف راجع ہے نہ کہ تمام مسلمانوں کی طرف۔ کیونکہ اگر تمام مسلمان مراد لیے جائیں تو الذین آمنوا وعملوا الصالحات

منکم با کلمه الذین آمنوا وعملوا الصالحات تکرار لازم می آمد پس حاصل معنی آنست که وعده برای جمعی است از شاهدان نزول آیه که تمکین دین بر وفق سعی ایشان واجتهاد و کوشش ایشان بظهور خواهد رسید۔"(ازالۃ الخفاء ۱/۱۱)

کے ساتھ منکم کا کلمہ زائد قرار پاتا ہے۔حاصل یہ ہے کہ یہ وعدہ آیت کے نزول کے وقت موجود ایک گروہ سے ہے کیا گیا ہے جس کی کوشش اور محنت سے دین کو غلبہ حاصل ہوگا۔''

اس بحث سے واضح ہے کہ قرآن مجید میں 'شہادت علی الناس' کے منصب کا ذکر دراصل صحابہ کے حوالے سے ہوا ہے۔تاریخ کی رو سے 'شہادت حق' کے معیار پر پورا اترنے والی جماعت بھی عملاً صرف صحابہ کرام ہی کی جماعت تھی اور اسی بنیاد پر انھیں استخلاف فی الارض کی دولت عطا فرمائی گئی تھی۔ 'شہادت' اور 'خیریت' کا منصب اور حکومت واقتدار کا وعدہ، یہ سب کے سب مکمل طور پر باہم مربوط اور ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں اور قرآن کے ان تمام بیانات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے انفرادی طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔

صحابہ کے جہاد کا متعین اور محدود ہدف

اب دوسرے نکتے کو دیکھیے:

بنی اسرائیل کے لیے حکومت واقتدار کا وعدہ، جیسا کہ ہم اوپر صحف سماوی کے نصوص کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں، متعین جغرافیائی حدود کے اندر تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی یہ بات بہت وضاحت سے نقل ہوئی ہے کہ آپ کی امت کو خطہ ارضی کے ایک محدود اور متعین علاقے میں حکومت واقتدار عطا کیا جائے گا۔

حضرت ثوبان سے روایت ہے:

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان اللـه زوی لی الارض فرایت مشارقها ومغاربها وان امتی سیبلغ ملکها ما زوی لی منها ۔(مسلم، رقم ۵۱۴۴)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ نے میرے لیے زمین سمیٹ دی اور میں نے اس کے مشرق ومغرب کے علاقے دیکھ لیے اور بے شک میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں تک پہنچے گی جو مجھے سمیٹ کر دکھائے گئے۔''

یہ روم اور فارس کی سلطنتوں کا علاقہ تھا اور آپ نے جزیرۂ عرب سے باہر حاصل ہونے والی ان فتوحات کی

www.shamiati.net

بشارت ہمیشہ ان دو سلطنتوں یا ان کے زیر اثر علاقوں ہی کے حوالے سے دی۔ امت مسلمہ کو عملاً حاصل ہونے والی فتوحات کا دائرہ روم وفارس کی سلطنتوں سے کہیں وسیع تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اہتمام سے ان کا ذکر اپنی پیش گوئیوں میں نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ علاقے اصلاً اور بالذات موعودہ فتوحات میں داخل نہیں تھے بلکہ ان کی نوعیت روم وفارس کی فتوحات کے تتمہ وتکملہ اور ان کے ناگزیر لوازم کی تھی، بلکہ بعض اقوام، مثلاً ترکوں اور اہل حبشہ کے بارے میں آپ نے صحابہ کو اس بات کی وصیت فرمائی کہ وہ ان کے خلاف ازخود جنگ کا اقدام نہ کریں۔ آپ نے فرمایا:

ثم ضربت الثالثة فرفعت لی مدائن الحبشة وما حولها من القری حتی رایتها بعینی قال رسول الله صلی الله علیه وسلم عند ذلك دعوا الحبشة ما ودعوكم واتركوا الترك ما تركوكم۔ (نسائی، رقم ۳۱۲۵)

’’پھر میں نے تیسری مرتبہ ضرب لگائی تو (اس سے اڑنے والی چنگاریوں کی روشنی میں) مجھے حبشہ اور اس کے اردگرد کی بستیاں دکھائی گئیں یہاں تک میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک اہل حبشہ تمھارے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں، تم بھی نہ کرنا۔ اور ترک بھی جب تک تم سے تعرض نہ کریں، تم ان سے گریز کرنا۔‘‘

www.ghamidi.net

یہ روایت مختلف طرق سے براء بن عازب رضی اللہ عنہ (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۶۸۲۰)، عبداللہ بن مسعود اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جبکہ اہل حبشہ کے بارے میں آپ کے اس جملے کو سعید بن المسیب نے اپنی ایک مرسل روایت میں نقل کیا ہے۔ (الاموال، ۹۵) اس کی تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو:

http://www.muslm.net/vb/archive/index.php/t-165484.html

ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ روایت صحابہ کے دور میں معروف تھی، چنانچہ سیدنا معاویہ کو جب اطلاع ملی کہ ان کے ایک کمانڈر نے ترکوں پر حملہ کر کے انھیں ایک لڑائی میں شکست دی ہے تو وہ اس پر سخت ناراض ہوئے اور اسے لکھا کہ جب تک میرا حکم نہ آئے، ترکوں سے لڑائی نہ کرنا کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ترک عربوں کو نکال کر دور دراز علاقے کی طرف دھکیل دیں گے۔ (فتح الباری ۶/۶۰۹) سیدنا عمر کے فوجی کمانڈر احنف بن قیس نے بھی ایک موقع پر ’اتركوا الترك ما تركوكم‘ کا حوالہ دیتے ہوئے ترکوں سے جنگ کرنے سے گریز کیا تھا۔ (البدایہ والنہایہ، ۷/۱۲۸)

ابن رشد لکھتے ہیں:

روی عن مالك انه قال لا یجوز ابتداء الحبشة بالحرب ولا الترك لما روی انه علیه الصلاة والسلام قال ذروا الحبشة ما وذرتکم وقد سئل مالك عن صحة هذا الاثر فلم یعترف بذلك لکن قال لم یزل الناس یتحامون غزوهم۔ (بدایۃ المجتہد ۲۷۹/۱)

''امام مالک سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اہل حبشہ اور ترکوں کے خلاف جنگ کی ابتدا کرنا جائز نہیں۔ ان کے اس قول کی وجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جب تک اہل حبشہ تم سے گریز کرتے رہیں، تم بھی گریز کرتے رہو۔ امام مالک سے اس حدیث کی صحت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اس کا اقرار نہیں کیا، بلکہ کہا کہ مسلمان اہل حبشہ کے خلاف جنگ کرنے سے گریز کرتے چلے آ رہے ہیں۔''

اس پس منظر میں یہ بات صحابہ پر بالکل واضح تھی کہ ان کی ذمہ داری اصلاً کوئی عالمگیر اسلامی حکومت قائم کرنا نہیں، بلکہ ایک محدود اور متعین دائرے میں اسلام کا غلبہ قائم کرنا ہے۔ چنانچہ خلفاے راشدین کے عہد میں کیے جانے والے جنگی اقدامات کے بارے میں تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ان کا ہدف وہی محدود علاقہ تھا جس کو فتح کرنے کی انھیں اجازت دی گئی تھی اور ان اقوام سے آگے انھوں نے ازخود کوئی جارحانہ اقدام کسی قوم کے خلاف نہیں کیا۔ اس ضمن میں تاریخی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد حکومت میں جہاد وقتال کے اقدامات کو ایک خاص دائرے تک محدود رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن ان کی کوشش اور خواہش کے باوجود معروضی حالات کے باعث اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ دیکھیے:

رومی سلطنت کے خلاف جہاد سے مقصود اصلاً شام کے علاقے پر قبضہ کرنا تھا اور یہ متعین ہدف آغاز ہی سے فریقین پر بالکل واضح تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنۂ ارتداد سے نمٹنے کے بعد جب سیدنا صدیق اکبر نے اپنے مختلف جرنیلوں کی قیادت میں شام کے مختلف علاقوں پر قبضے کے لیے لشکر روانہ کیے تو قیصر روم نے اس موقع پر کوشش کی کہ شام کا علاقہ صلحاً مسلمانوں کے حوالے کر کے مستقل بنیادوں پر ان کی پیش قدمی کو روک دیا جائے۔ اس نے رومی سلطنت کے اہل حل وعقد سے کہا:

ویحکم ان هولاء اهل دین جدید وانهم لا قبل لاحد بهم فاطیعونی

''تمھارا ناس ہو، یہ لوگ ایک نئے دین کے پیروکار ہیں اور کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے میری

وصالحوهم بما تصالحونهم على نصف خراج الشام و يبقى لكم جبال الروم وان انتم ابيتم ذلك اخذوا منكم الشام وضيقوا عليكم جبال الروم۔
(ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۵/۷)

بات مان لو اور ان کے ساتھ اس بات پر صلح کر لو کہ شام کا آدھا خراج ان کو ادا کیا جائے گا اور جبال الروم تمھارے لیے محفوظ رہیں گے۔ اگر تم یہ بات نہیں مانو گے تو وہ تم سے شام کا علاقہ بھی لے لیں گے اور جبال الروم میں بھی تمھیں پریشان کیے رکھیں گے۔''

حضرت صدیق اکبر کی طرف سے خالد بن ولید کو عراق کے محاذ پر مامور کیا گیا تھا جہاں سے انھیں ضرورت کے تحت شام کے محاذ پر بھیج دیا گیا، لیکن انھیں یہ ہدایت کر دی کہ شام کی فتح سے فارغ ہو کر واپس عراق چلے جائیں۔ (البدایہ والنہایہ ۵/۷) اجنادین میں فتح کے بعد خالد بن ولید نے سیدنا ابوبکر کو اس کی اطلاع بھیجی تو جوابی خط میں انھوں نے لکھا:

اجعل السير دابك الى ان تطا اقصى ارضهم وانزل على جنة الشام الى ان يـاذن الله تعالىٰ بفتحها على يديك ثم الى حمص والمعرات واطلب انطاكية ..... وان نزلت على المدينة العظمى ذات الجبل المطل انطاكية فان الملك هناك فان صالحك فصالحه وان حاربك فحاربه ولا تدخل الدروب او تكاتبنى بذالك۔
(واقدی، فتوح الشام ۱۳۲)

''برابر بڑھتے چلے جاؤ یہاں تک کہ ان کی سرزمین کے آخری کنارے تک پہنچ جاؤ۔ شام کے باغات پر جا کر ٹھہرو یہاں تک کہ اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں مفتوح کر دے۔ پھر حمص اور معرات کو فتح کرو اور انطاکیہ کا قصد کرو۔۔۔ جب اونچے پہاڑوں والے بہت بڑے شہر انطاکیہ پہنچ جاؤ تو رومیوں کا بادشاہ وہیں ہے۔ اگر وہ صلح کرنا چاہے تو اس سے صلح کر لو اور اگر جنگ کرنا چاہے تو اس سے جنگ کرو۔ پہاڑی دروں میں داخل نہ ہونا جب تک کہ مجھ سے خط و کتابت کر کے مشورہ نہ کر لو۔''

وفات سے قبل انھوں نے سیدنا عمر کو بھی وصیت کی کہ وہ عراق کے محاذ کی طرف بھر پور توجہ دیں اور جیسے ہی شام کا علاقہ فتح ہو جائے، خالد بن ولید کے لشکر کو بھی وہاں سے ہٹا کر عراق کے محاذ پر بھیج دیا جائے، کیونکہ وہ اور ان کے ساتھی وہاں کی جنگ کا زیادہ تجربہ رکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ، ۱۸/۷) چنانچہ سیدنا عمرؓ نے شام کے مفتوح ہونے کے بعد اس محاذ پر پیش قدمی روک دی اور بنو کنانہ اور بنو ازد کے جنگ جوؤں کی ایک جماعت نے ان کے پاس حاضر ہو کر شام کے محاذ پر لڑنے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے فرمایا:

www.ghamidi.net

وقد ماعلی عمر عزاة بنی کنانة والاذد فی سبعمائة جمیعاً فقال ای الوجود احب الیکم قالوا الشام اسلافنا اسلافنا فقال ذلك قد کفیتموه العراق العراق ذروا بلدة قد قلل الله شوکتها وعددها واستقبلوا جهاد قوم قد حووا فنون العیش۔ (طبری، الکامل فی التاریخ ۳/ ۴۶۳)

''بنو کنانہ اور بنو ازد کے سات سو جنگجو سیدنا عمر کی خدمت میں آئے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ کس محاذ پر لڑنا پسند کرو گے؟ انھوں نے کہا: شام، جو ہمارے اسلاف کا علاقہ ہے۔ آپ نے کہا، وہاں کا بندوبست ہو چکا ہے۔ تم عراق کی طرف جاؤ۔ اس ملک کو چھوڑ دو جہاں اللہ نے قوت وشوکت اور اسباب ووسائل کم رکھے ہیں۔ اس کے بجائے اس قوم کے ساتھ لڑنے کے لیے روانہ ہو جاؤ جہاں قسم قسم کے اسباب معاش میسر ہیں۔''

۱۶ ہجری میں فتح بیت المقدس کے موقع پر انھوں نے اہل شہر پر یہ شرط عائد کی کہ رومیوں کو تین دن کے اندر شہر سے نکال دیں۔ (البدایہ والنہایہ، ۷/ ۵۵) اس کی وجہ بھی غالباً یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شہر میں آباد ان رومیوں کے ذریعے سے رومی سلطنت مسلمانوں کے خلاف موقع بموقع فتنہ انگیزی کی کوشش کرتی رہے۔ یزید بن ابی سفیان کو قیساریہ پر حملے کی ہدایت دیتے ہوئے بھی انھوں نے یہی وجہ بیان کی کہ اس طرح شام کے علاقے میں قیصر روم کی ساری امیدیں دم توڑ جائیں گی:

انه لا یزال قیصر طامعا فی الشام ما بقی فیها احد من اهل طاعته متبعا ولقد فتحتموها قطع الله رجاء ه من جمیع الشام۔ (ازدی، فتوح الشام ۲۵۰)

''اگر شام میں کوئی بھی شخص قیصر کی اطاعت اور اتباع کرنے والے باقی رہے گا تو شام کے بارے میں اس کی خواہش باقی رہے گی اور اگر تم قیساریہ کو بھی فتح کر لو گے تو اللہ پورے شام سے اس کی امیدوں کو ختم کر دے گا۔''

اس محاذ پر دوبارہ پیش قدمی کی اجازت انھوں نے صرف اس وقت دی جب ۱۷ ہجری میں اہل روم نے مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں پر حملہ کرنے کی جرات کی۔ طبری لکھتے ہیں:

اول ما اذن عمر للجند بالانسیاح ان الروم خرجوا وقد تکاتبوا هم واهل الجزیرة یریدون ابا عبیدة والمسلمین بحمص۔ (الکامل فی التاریخ ۴/ ۵۰)

''سیدنا عمر نے سب سے پہلے اپنے لشکر کو رومیوں کے علاقے میں گھسنے کی اجازت اس وقت دی جب اہل روم اٹھے اور اہل جزیرہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے انھوں نے حمص میں ابوعبیدہ اور ان کے لشکر پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا۔''

www.ghamidi.net

شام کے بعض علاقوں پر قبضہ بھی ابتداءً مسلم جرنیلوں کے پیش نظر نہیں تھا۔ مثال کے طور پر بلاذری بتاتے ہیں:

کان یزید بن ابی سفیان وجه معاویة الی سواحل دمشق سوی اطرابلس فانه لم یکن یطمع فیه۔ (فتوح البلدان ص ۱۳۴)	''یزید بن ابی سفیان نے معاویہ کو دمشق کے ساحلی علاقوں کی طرف بھیجا، لیکن اطرابلس ان میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہ اسے فتح کرنے کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔''

رومی حکومت کے زیر تسلط علاقوں میں بحیرۂ روم میں موجود بہت سے جزیرے بھی شامل تھے اور ان پر حملہ آور ہونے کا واحد راستہ سمندر تھا۔ شام کے محاذ کے کمانڈر یزید بن ابی سفیان کی وفات کے بعد ان کے بھائی سیدنا معاویہ نے سیدنا عمر کو خط لکھا اور ساحلی علاقوں کی صورت حال بیان کی، تاہم انھوں نے سمندر میں لشکر کشی کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ لکھا کہ وہاں کے قلعوں کی مرمت کروا کر ان میں فوجیوں کو متعین کرو، نگرانی کے لیے چوکیدار مقرر کرو اور وہاں آگ جلانے کے ضروری انتظامات کرو۔ (بلاذری، فتوح البلدان، ص ۱۳۴، ۱۳۵)

سیدنا عثمان کے زمانے میں امیر معاویہ نے ان سے دوبارہ جزیرۂ قبرص کا قریبی محل وقوع بیان کرتے ہوئے اس پر حملے کی اجازت طلب کی تو سیدنا عثمان نے ان کو لکھا:

قد شهدت ما رد علیك عمر رحمه الله حین استامرته فی غزو البحر ۔(بلاذری، فتوح البلدان، ج ۱، ص ۱۵۷)	''جب تم نے عمر رحمہ اللہ سے سمندر میں لشکر کشی کی اجازت مانگی تھی اور انہوں نے اس کو مسترد کر دیا تھا تو میں اس موقع پر موجود تھا۔''

تاہم امیر معاویہ اس سلسلے میں مسلسل اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ ۲۷ ہجری میں سیدنا عثمان نے بالآخر ان کو اجازت دے دی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس حملے کے لیے جبراً کسی کی ڈیوٹی نہ لگائی جائے، بلکہ صرف وہی افراد لشکر میں شریک ہوں جو اپنی رضا مندی سے جانا چاہتے ہیں۔ (بلاذری، فتوح البلدان، ص ۱۵۹)

قادسیہ، مدائن اور جلولاء کے معرکوں کے بعد ۱۶ ہجری میں جنوبی عراق کا علاقہ، جس کو عرب مورخین 'سواد' کے نام سے یاد کرتے ہیں، مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ سعد بن ابی وقاص نے مزید پیش قدمی کی اجازت چاہی تو سیدنا عمر نے انھیں اس سے روک دیا۔ طبری کا بیان ہے:

ثـم كتـب سـعد الى عمر بما فتح الله عـلـى الـمسلمين فكتب عليه عمر ان قف و لا تـطـلبـوا غير ذلك فكتب اليه سـعـد ايـضـا انما هى سربة ادركناها والارض بين ايدينا فكتب اليه عمر ان قف مـكـــانك و لا تتبـعهـم ۔ (طبری، ۵۷۹/۳)

''پھر سعد نے خط لکھ کر سیدنا عمر کو مسلمانوں کو حاصل ہونے والی فتوحات کی خبر دی۔ سیدنا عمر نے جواب میں لکھا کہ بس اب رک جاؤ اور مزید علاقے فتح نہ کرو۔ سعد نے ان کو لکھا کہ یہ تو ایک ریوڑ ہے جس پر ہم نے قابو پا لیا ہے (تو جو شکار ہاتھ میں آیا ہے، اسے کیوں جانے دیں؟) اور زمین ہمارے سامنے پڑی ہوئی (اور فتح کی منتظر) ہے۔ سیدنا عمر نے ان کو دوبارہ یہی لکھا ہے کہ بس، اپنی جگہ ٹھہرے رہو اور ان کو پیچھا نہ کرو۔''

ایک روایت کے مطابق الفاظ یہ تھے:

امـا بـعـد فـقـد جاء نی مابين العذيب وحـلـوان وفـى ذلـكم ما يكفيكم ان اتـقيتـم واصـلحتم قال و كتب اجعلوا بيـنـكم وبين العدو مفازة ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۵۶۰۸)

''اما بعد، عذیب اور حلوان کا علاقہ میرے قبضے میں آ چکا ہے اور اگر تم اللہ سے ڈرتے اور اصلاح احوال کرتے رہو تو یہ علاقہ تمھارے لیے کافی ہے۔ نیز انھوں نے ان کو لکھا کہ اپنے اور دشمن کے علاقے کے درمیان زمینی فاصلہ رکھو۔''

طبری نے دوسری جگہ لکھا ہے:

و كتبوا الى عمر بفتح جلولاء وبنزول الـقـعـقـــاع حـلـوان واستـاذنوه فـى اتبـاعهـم فـابـى وقال لوددت ان بين السـواد وبين الجبل سدا لا يخلصون اليـنـا ولا نـخـلـص اليهـم حسبنا من الــريف السـوـاد انـى آثـرت سـلامة المسلمين على الانفال۔ (طبری، ۲۸/۴)

''انھوں نے سیدنا عمر کو خط لکھ کر جلولاء کے فتح ہونے کی خبر دی اور بتایا کہ قعقاع حلوان کے مقام پر مقیم ہیں۔ نیز انھوں نے دشمن کا پیچھا کرنے کی اجازت مانگی لیکن سیدنا عمر نے انکار کر دیا اور کہا کہ میری یہ خواہش ہے کہ سواد اور جبل کے علاقے کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ کھڑی ہو جائے جس کو عبور کر کے نہ وہ ہماری طرف آ سکیں اور نہ ہم ان کی طرف جا سکیں۔ ان شاداب خطوں میں سے ہمارے لیے سواد ہی کافی ہے۔ مجھے مال غنیمت کے مقابلے میں مسلمانوں کی سلامتی زیادہ عزیز ہے۔''

www.ghamidi.net

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

كانت الكوفة وسوادها والفروج حلوان والموصل وماسبذان وقرقيسياء .... ونهاهم عما وراء ذلك ولم ياذن لهم فى الانسياح ـ(۵۰/۴)

''(فتح مدائن کے بعد مسلمانوں کے قبضے میں بس یہ علاقے تھے) کوفہ، سواد، حلوان، موصل، ماسبذان اور قرقیسیاء۔ اور سیدنا عمر نے ان کو ان سے آگے بڑھنے سے منع کر دیا تھا اور بلاد عجم میں گھسنے کی اجازت نہیں دی تھی۔''

طبری نے یہ بات متعدد جگہوں پر بیان کی ہے کہ سیدنا عمر عراق کے سرسبز وشاداب خطے میں سے صرف سواد کے علاقے پر قناعت کرنا چاہتے تھے:

وكان عمر قد رضى بالسواد من الريف ـ(۳۱/۴)

''اور سیدنا عمر عراق کے سرسبز وشاداب علاقوں میں سے صرف سواد کے علاقے پر اکتفا کرنا چاہتے تھے۔''

ابتداء اہل فارس نے بھی اس تقسیم کو قبول کر لیا۔ طبری لکھتے ہیں:

وقالوا جميعا: ولما بلغ اهل فارس قول عمر ورايه فى السواد وما خلفه قالوا ونحن نرضى بمثل الذى رضوا به ـ(۳۳/۴)

''تمام راوی یہ بیان کرتے ہیں کہ جب اہل فارس تک سواد اور اس سے پیچھے کے علاقے کے بارے میں سیدنا عمر کی رائے پہنچی تو انھوں نے کہا کہ ہم بھی اس پر راضی ہیں۔''

الجزیرہ کا علاقہ فتح ہو گیا تو یہاں بھی سیدنا عمر نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ پیش قدمی کا سلسلہ کسی طرح سے یہیں رک جائے۔ طبری لکھتے ہیں:

وقد قال عمر حسبنا لاهل البصرة سوادهم والاهواز وددت ان بيننا وبين فارس جبلا من نار لايصلون الينا منه ولا نصل اليهم كما قال لاهل الكوفة وددت ان بينهم وبين الجبل جبلا من نار لايصلون الينا منه ولا نصل اليهم ـ(۷۹/۴)

سیدنا عمر نے کہا: ہم اہل بصرہ کے لیے سواد اور اہواز کا علاقہ کافی ہے۔ کاش ہمارے اور فارس کے علاقے کے درمیان آگ کا کوئی پہاڑ ہوتا۔ نہ وہ ہم تک پہنچ پاتے اور نہ ہم ان تک پہنچ پاتے۔ اسی طرح آپ نے اہل کوفہ کے بارے میں کہا تھا کہ کاش ان کے اور جبل کے علاقے کے مابین آگ کا کوئی پہاڑ ہوتا۔ نہ وہ اس طرف آ سکتے اور نہ ہم ادھر جا سکتے۔''

علاء بن الحضرمی سیدنا ابوبکرؓ کے زمانے سے بحرین کے گورنر مقرر تھے۔ سیدنا عمر نے اپنے عہد میں انھیں برقرار

www.ghamidi.net

رکھا اور ان کو تاکید کی کہ وہ سمندر عبور کر کے فارس کے علاقے میں داخل ہونے کی کوشش نہ کریں۔ تاہم انھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ طبری کا بیان ہے:

واستعمله عمر ونهاه عن البحر فلم يقدر في الطاعة والمعصية وعواقبهما فندب اهل البحرين الى فارس فتسرعوا الى ذلك ..... فحملهم في البحر الى فارس بغير اذن عمر وكان عمر لا ياذن لاحد في ركوبه غازيا يكره التغرير بجنده استنانا بالنبي صلى الله عليه وسلم وبابي بكر لم يغز فيه النبي صلى الله عليه وسلم ولا ابو بكر۔ (۷۹/۴، ۸۰)

''سیدنا عمر نے ان کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور انھیں سمندر میں مہم جوئی سے منع کیا، لیکن وہ اس حکم کی پابندی یا اس کی خلاف ورزی کی اہمیت اور ان کے نتائج کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کر سکے اور اہل بحرین کو اہل فارس پر حملہ کرنے کی دعوت دے دی جس پر وہ فوراً تیار ہو گئے۔ ۔۔ چنانچہ وہ سیدنا عمر کی اجازت کے بغیر ان کو لے کر سمندر میں روانہ ہو گئے۔ سیدنا عمر کسی کو بھی لشکر کشی کی غرض سے سمندر کے سفر کی اجازت نہیں دیتے تھے جس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ وہ اپنے لشکر کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے اور دوسری یہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر کے طریقے پر قائم رہنا چاہتے تھے کیونکہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے راستے سے لشکر کشی کی اور نہ سیدنا ابوبکر نے۔''

سیدنا عمر کو اس کی اطلاع ملی تو وہ شدید ناراض ہوئے اور عمرو کو ان کے عہدے سے معزول کر کے انھیں حکم دیا کہ وہ سعد بن ابی وقاص کے لشکر میں ان کے ماتحت کی حیثیت سے شریک ہو جائیں۔ (طبری، ۸۱/۴)

یاقوت حموی لکھتے ہیں:

ان عمر بن الخطاب اراد ان يتخذ للمسلمين مصرا وكان المسلمون قد غزوا من قبل البحرين توج ونوبندجان وطاسان فلما فتحوها كتبوا اليه انا وجدنا بطاسان مكانا لا باس به فكتب اليهم ان بيني وبينكم

''عمر بن الخطاب چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے ایک شہر آباد کریں۔ مسلمانوں نے بحرین کی جانب سے توج اور بندجان اور طاسان پر حملہ کیا تھا۔ جب انھوں نے ان علاقوں کو فتح کر لیا تو امیر المومنین کو لکھا کہ ہمیں طاسان میں (شہر بسانے کے لیے) ایک مناسب جگہ مل گئی ہے۔

دجلة لا حاجة فی شئ بینی و بینه دجلة ان تتخذوه مصرا۔ (معجم البلدان ۱/۴۳۰)

امیر المومنین نے جواب میں لکھا کہ میرے اور تمھارے درمیان دجلہ حائل ہے اور میں کسی ایسی جگہ پر شہر نہیں بسانا چاہتا جس کے اور میرے درمیان دجلہ حائل ہو۔''

فارس کے علاقے میں عام لشکر کشی کی اجازت سیدنا عمر نے ۱۷ ہجری میں احنف بن قیس کی تجویز پر دی۔ سیدنا عمر کو جب مسلسل اہل فارس کی طرف سے شورش اور بغاوت کی اطلاعات ملیں تو انھوں نے اس کے اسباب کی تحقیق کی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید مسلمان عمال وہاں کے باشندوں کے ساتھ ناروا سلوک اختیار کرتے ہیں جس سے تنگ آ کر وہ بغاوت پر مجبور ہو جاتے ہیں، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ بات درست نہیں۔ تاہم اس کے علاوہ بدامنی اور بغاوت کا کوئی اور واضح سبب بھی ان کے سامنے نہ آ سکا۔ اس موقع پر احنف بن قیس نے اصل صورت حال ان کے سامنے رکھی اور کہا:

یا امیر المومنین اخبرك انك نهیتنا عن الانسیاح فی البلاد و امرتنا بالاقتصار علی ما فی ایدینا و ان ملك فارس حی بین اظهرهم و انهم لا یزالون یساجلوننا ما دام ملکهم فیهم ولم یجتمع ملکان فاتفقا حتی یخرج احدهما صاحبه وقد رایت انا لم ناخذ شیئا بعد شئ الا بانبعاثهم و ان ملکهم هو الذی یبعثهم و لا یزال هذا دابهم حتی تاذن لنا فلنسح فی بلادهم حتی نزیله عن فارس و نخرجه من مملکته و عز امته فهنالك ینقطع رجاء اهل فارس و یضربون جاشا۔ (طبری ۴/۸۹)

''اے امیر المومنین! میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں۔ آپ نے ہمیں مملکت فارس میں دور تک گھسنے سے منع کر رکھا ہے اور ان علاقوں پر اکتفا کرنے کا حکم دیا ہے جو ہمارے قبضے میں ہیں، جبکہ اہل فارس کا بادشاہ زندہ سلامت ان کے مابین موجود ہے اور جب تک وہ رہے گا، اہل فارس ہمارے ساتھ آمادۂ پیکار رہیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک سرزمین میں دو بادشاہ اتفاق سے رہیں۔ ان میں سے ایک کو لازماً دوسرے کو نکالنا پڑے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں اہل فارس کی بغاوتوں ہی کے نتیجے میں ایک کے بعد دوسرے علاقے پر قبضہ کرنا پڑا ہے اور ان تمام بغاوتوں کا سرچشمہ ان کا بادشاہ ہے۔ اور ان کا وطیرہ یہی رہے گا جب تک کہ آپ ہمیں اجازت نہیں دیتے کہ ہم ان کی مملکت میں گھس کر ان کے بادشاہ کو وہاں سے ہٹا دیں اور اس کی سلطنت اور سربلندی کی جگہ

www.ghamidi.net

سے اس کو نکال دیں۔ اس صورت میں اہل فارس کی امیدیں ٹوٹ جائیں گی اور وہ پرسکون ہو جائیں گے۔''

سیدنا عمران کے اس تجزیے پر مطمئن ہوئے اور اس کے بعد بلاد فارس پر لشکر کشی کی اجازت دے دی۔

لما رای عمر ان یزدجرد یبعث علیه فی کل عام حربا وقیل له لایزال هذا الداب حتی یخرج من مملکته اذن للناس فی الانسیاح فی ارض العجم حتی یغلبوا یزدجرد علی ما کان فی یدی کسری۔ (طبری، ۱۳۸/۴)

''جب سیدنا عمر نے دیکھا کہ یزدگرد ہر سال کوئی نہ کوئی معرکہ کھڑا کر دیتا ہے اور ان کو بتایا گیا کہ اگر اسے اس کی مملکت سے نکالا نہ گیا تو وہ یونہی کرتا رہے گا، تب انھوں نے مسلمانوں کی اجازت دی کہ وہ سرزمین عجم میں گھس جائیں اور یزدگرد سے وہ سارا علاقہ چھین لیں جو اس کے قبضے میں ہے۔''

یزدگرد کے بارے میں لکھا ہے:

وکاتب من مرو من بقی من الاعاجم فی ما لم یفتتحه المسلمون فدانوا له حتی اثار اهل فارس والهرمزان فنکثوا وثار اهل الجبال والفیرزان فنکثوا وصار ذلك داعیة الی اذن عمر للمسلمین فی الانسیاح۔ (طبری ۱۶۷/۴)

''اور اس نے مرو میں بیٹھ کر ان علاقوں کے اہل عجم سے خط وکتابت کی جن کو مسلمانوں نے فتح نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اس کی اطاعت قبول کی، یہاں تک اس نے فارس اور ہرمزان کے باشندوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف ابھار کر معاہدہ توڑنے پر آمادہ کر لیا اور جبال اور فیرزان کے لوگ بھی معاہدے سے منحرف ہو گئے۔ اس صورت حال کے باعث سیدنا عمر کو مسلمانوں کو اجازت دینا پڑی کہ وہ بلاد عجم میں دور تک گھس جائیں (اور بغاوتوں کو فرو کریں)۔''

خراسان کے فتح ہونے کی اطلاع ملی تو بھی سیدنا عمر نے اس پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا:

کتب الاحنف الی عمر بفتح خراسان فقال لوددت انی لم اکن بعثت الیها جندا ولوددت انه کان بیننا وبینها بحر من نار فقال علی ولم یا امیر

''احنف نے سیدنا کو خط لکھ کر خراسان کے فتح ہونے کی اطلاع دی تو انھوں نے کہا: میری خواہش تو یہی تھی کہ میں وہاں کوئی لشکر نہ بھیجتا اور میں تو یہ چاہتا تھا کہ اس کے اور ہمارے درمیان آگ کا کوئی سمندر

www.ghamidi.net

المومنين؟قال لان اهلها سينفضون منها ثلاث مرات فيجتاحون فى الثالثة فكان ان يكون ذلك باهلها احب الى من ان يكون بالمسلمين۔ (طبری،۱۶۸/۴)

ہوتا (جسے عبور نہ کیا جا سکتا) سیدنا علی نے کہا: اے امیر المومنین، لیکن کیوں؟ سیدنا عمر نے کہا کہ یہاں کے باشندے تین مرتبہ گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوں گے اور تیسری مرتبہ تو بالکل برباد ہو جائیں گے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ آفت انھی لوگوں پر آئے اور مسلمان اس سے محفوظ رہیں۔''

نیز انھوں نے احنف بن قیس کو مزید پیش قدمی سے روک دیا:

وكتب عمر الى الاحنف ينهاه عن العبور الى ما وراء النهر وقال احفظ ما بيدك من بلاد خراسان۔ (البدایہ والنہایہ، ۱۲۷/۷)

''سیدنا عمر نے احنف کو خط لکھ کر انھیں دریا پار کے علاقے میں داخل ہونے سے روک دیا اور کہا کہ تمھارے زیر نگیں جو خراسان کا علاقہ ہے، بس اسی کو سنبھالو۔''

فارس کی فتوحات کے آخری مراحل میں نعمان بن مقرن نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

قد علمتم ما اعزكم الله به من هذا الدين وما وعدكم من الظهور وقد انجز لكم هوادى ما وعدكم وصدوره وانما بقيت اعجازه واكارعه والله منجز وعده ومتبع آخر ذلك اوله۔ (طبری،۱۳۱/۴)

''تم اس سربلندی سے بھی اچھی طرح واقف ہو جو اللہ نے تمھیں اس دین کی وجہ سے دی ہے اور غلبہ کے اس وعدے سے بھی جو اس نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔ دیکھو، اللہ نے اپنے وعدے کا بڑا حصہ تو پورا کر دیا ہے اور اب اس کا بس تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ اور اللہ اپنے وعدے کو یقیناً پورا کرے گا اور پہلے کی طرح آخری حصے کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔''

سیدنا عمر نے فرمایا:

رايت انه لم يبق شئ يفتح بعد ارض كسرى (ابو یوسف، الخراج، ص ۲۷)

''میرا خیال ہے کہ کسریٰ کی سرزمین کے بعد اب کوئی علاقہ فتح نہیں ہوگا۔''

ابن کثیرؒ نے فتوحات کے معاملے میں سیدنا عمر کی پالیسی ان الفاظ میں واضح کی ہے:

والمقصود ان عمر كان يحجر على المسلمين ان يتوسعوا فى بلاد العجم

''مطلب یہ ہے کہ سیدنا عمر نے اہل عجم کے خوف کے باعث مسلمانوں کے اس سے روکے رکھا کہ وہ بلاد

خوفا علیهم من العجم حتی اشار علیه الاحنف بن قیس بان المصلحة تقتضی توسعهم فی الفتوحات فان الملك یزدجرد لا یزال یستحثهم علی قتال المسلمین وان لم یستاصل شاو العجم والا طمعوا فی الاسلام واهله فاستحسن عمر ذلك منه وصوبه واذن للمسلمین فی التوسع فی بلاد العجم ففتحوا بسبب ذلك شیئا کثیرا۔ (البدایہ والنہایہ،۷/۸۸)

عجم میں اپنی فتوحات کا سلسلہ بہت زیادہ پھیلائیں، یہاں تک کہ احنف بن قیس نے انھیں مشورہ دیا کہ مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ فتوحات کی توسیع کی جائے، کیونکہ شاہ فارس یزدگرد مسلسل اپنی قوم کو مسلمانوں کے خلاف قتال پر ابھار رہا ہے اور اگر ان کی ہمت نہ توڑی گئی تو وہ (اپنی سرزمین کے دفاع سے بڑھ کر) خود اسلام اور اہل اسلام کو اپنا نشانہ بنا لیں گے۔ سیدنا عمر نے اس رائے کو پسند کیا اور اس کو درست قرار دے کر مسلمانوں کو وسیع پیمانے پر بلاد عجم کو فتح کرنے کی اجازت دے دی، جس کے باعث مسلمانوں نے بہت سے علاقے فتح کر لیے۔''

یزدگرد نے مسلمانوں کے مقابلے میں جن بادشاہوں سے مدد چاہی، ان میں سندھ اور چین کے بادشاہوں کے علاوہ تاتاری بادشاہ خاقان بھی شامل تھا۔ چین کے بادشاہ نے تو یزدگرد کی مدد سے معذرت کر لی، تاہم خاقان نے مسلمانوں کے خلاف اسے بھرپور امداد فراہم کی۔ خراسان کی فتح کے بعد وہ یزدگرد کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج لے کر آیا اور بلخ کا قبضہ مسلمانوں سے چھڑا لیا۔ پھر مرو الروذ کے مقام پر ایک معرکہ ہوا۔ تیسرے دن تاتاری فوجیں میدان میں نہیں آئیں۔ احنف بن قیس نے ان کا پیچھا کرنے سے گریز کیا:

وقد قال المسلمون للاحنف ما تری فی اتباعهم؟ فقال اقیموا بمکانکم ودعوهم وقد اصاب الاحنف فی ذلك فقد جاء فی الحدیث اترکوا الترك ما ترکوکم۔ (البدایہ والنہایہ، ۷/۱۲۸)

''مسلمانوں نے احنف سے پوچھا کہ ان کا پیچھا کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا، اپنی جگہ ٹھہرے رہو اور ان کو جانے دو۔ (ابن کثیر کہتے ہیں) احنف کا یہ فیصلہ درست تھا کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ترک جب تک تمھارے مقابلے میں نہ آئیں، ان سے تعرض نہ کرو۔''

(باقی)

ریحان احمد یوسفی

تو تو ہے، میں میں ہوں

www.ghamidi.net

خلافت راشدہ کے بعد عربوں کی دو عظیم حکومتیں قائم ہوئیں۔ ایک کا تعلق بنوامیہ سے تھا اور دوسرے کا بنوعباس سے۔ بنوعباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کی اولاد میں سے تھے۔ عباسی خاندان نے پانچ صدیوں تک حکومت کی۔ تہذیب و تمدن، علم و حکمت، قوت و اقتدار غرض ہر اعتبار سے ان کے دور میں اسلامی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔

عباسی خاندان کا سب سے بڑا خلیفہ ہارون الرشید تھا۔ اس کے اقتدار کی عظمت اندازہ ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ دارالخلافہ بغداد میں خشک سالی ہوگئی۔ ایک روز خلیفہ اپنے محل کی چھت پر کھڑا تھا کہ ابر چھا گیا، مگر بادل برسے بغیر آگے چلا گیا۔ اس پر ہارون رشید نے کہا: اے بادل تو جہاں چاہے جا کر برس، تیری پیداوار کا خراج میرے ہی پاس آئے گا۔

ہارون رشید اپنی ذاتی زندگی میں ایک صالح آدمی تھا۔ اس کی ایک دعا اس طرح نقل ہوئی ہے۔

یا رب انت انت و انا انا۔ انا العواد بالذنب و انت العواد بالمغفرة۔ فاغفرلی

یعنی اے میرے رب تو تو ہے اور میں میں ہوں۔ میں بار بار گناہ کرتا ہوں اور تو بار بار بخشنے والا ہے۔ پس مجھے بخش دے۔

اس دنیا میں ساری بڑائی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ کسی انسان کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی دی ہوئی بھیک سے ہر آدمی پل رہا ہے۔ اس کی بخشی ہوئی پناہ میں ہر آدمی جی رہا ہے۔ یہ حقیقت اگر

انسان کو یادرہے تو خدا اس کی ہر امید اور ہر خوف کا مرکز بن جائے گا۔ وہ سب سے بڑھ کر اس سے محبت کرے گا اور سب سے زیادہ اسی سے ڈرے گا۔ پنے بشری تقاضوں کی بنا پر اس انسان سے کوئی غلطی تو ہوسکتی ہے، مگر یہ غلطی کبھی سرکش اور بے نیازی میں نہیں بدل سکتی۔

رب کی عظمت اور اس کے سامنے اپنے بے وقعت ہونے کا احساس اگر زندہ ہے تو انسان بادشاہ بن کر بھی غافل نہیں رہتا۔ یہ احساس مردہ ہو جائے تو معمولی انسان بھی خود کو فرعون سمجھتا ہے۔

Honey Trap

امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کا شمار دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں میں ہوتا ہے۔ سوویت یونین کے انہدام سے قبل یہی پانچ طاقتیں ایٹمی اسلحہ کی حامل تھیں۔ اس زمانے میں دیگر بعض ممالک نے بھی ایٹمی اسلحہ کے حصول کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ان میں سرائیل کا نام سرفہرست ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسرائیل نے مغربی طاقتوں کی مدد سے سن ساٹھ کی دہائی میں یہ صلاحیت حاصل کر لی تھی مگر بین الاقوامی دباؤ کے خوف سے اس صلاحیت کا اظہار نہیں کیا۔

1986 میں دنیا کو پہلی بار اس وقت اسرائیل کی ایٹمی طاقت کے بارے میں معلوم ہوا جب صحرائے نقب میں واقع اسرائیلی ایٹمی تنصیب DIMON کے ایک اہلکار مردکائی ونونو نے برطانوی اخبار 'سنڈے ٹائمز' کو ایک انٹرویو دیا۔ اس انٹرویو میں اس نے اسرائیل کے خفیہ ایٹمی پروگرام کی تفصیلات سے پہلی دفعہ پردہ اٹھایا۔ جس سے دنیا بھر میں کھلبلی مچ گئی۔

چنانچہ اسرائیل کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس سے قبل یہ اہلکار مزید مسائل پیدا کرے اسے واپس اسرائیل لا کر اس کے خلاف مقدمہ چلنا چاہیے۔ لہٰذا اسے پھانسنے کے لیے اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد نے ایک Honey Trap یا دامِ الفت تیار کیا۔ موساد کی ایک انتہائی حسین خاتون ایجنٹ نے مردکائی ونونو سے لندن میں دوستی کی۔ اسے اپنی حسن کے جال میں پھنسایا۔ پھر اسے تفریح کے لیے روم چلنے کی پیشکش کی۔ روم کے ایک ہوٹل میں اسے نشہ آور دوا کھانے میں ملا کر دی گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو سامنے کوئی دلربا حسینہ نہیں، اسرائیل کی عدالت تھی، جس نے اسے غداری کے الزام میں 18 سال قید کی سزا سنا دی۔

یہ واقعہ جو ایک فرد پر گزرا، ہر انسان کا حقیقی مسئلہ ہے۔ آزمائش کی اس دنیا میں انسان ہر لمحہ حالت جنگ میں ہے۔ اس کے دشمن شیطان نے اس کے سامنے طرح طرح کے Honey Trap بچھا رکھے ہیں۔ انسان دنیا کے

اس جال کو جال نہیں سمجھتا۔ وہ ساری زندگی دنیا کی ظاہری خوبصورتی اور لذت کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اس حسن کے پیچھے جہنم کی جو قید چھپی ہے، وہ اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کے فرشتے موت کی بیہوشی لیے اچانک نمودار ہوتے ہیں اور جب آنکھ کھلتی ہے تو جہنم کے قید خانے کے سوا کچھ اور سامنے نہیں رہتا۔

کامیاب انسان وہ نہیں جس نے دنیا میں بہت ترقی کی۔ کامیاب انسان وہ ہے جس نے دنیا کے Honey Trap میں پھنسنے کے بجائے، خدا کی ابدی جنت کی ابدی نعمتیں حاصل کر لیں۔

گندے انڈے

عام طور پر لوگوں کی یہ کوشش اور خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ سودا سلف لینے باہر جائیں تو کوئی دکاندار گلی سڑی اور باسی اشیا کوئی اس کے حوالے نہ کر دے۔ تاہم دکانوں پر ملنے والی اشیا میں غالباً انڈا واحد چیز ہے کہ جس کی ظاہر حالت دیکھ کر اس کے خراب ہونے کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ انڈے کا خراب ہونا اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب گھر لانے کے بعد انڈے پر چڑھا خول توڑا جائے۔ تب ہی پتا چلتا ہے کہ کھانے کے استعمال میں آنے والی سفیدی اور زردی صحیح حالت میں ہیں یا خراب ہو چکے ہیں۔

آج کے انسان کا معاملہ بھی کچھ انڈے ہی جیسا ہے۔ آج جس شخص سے بات کی جائے وہ اپنی گفتگو اور ظاہری چیزوں سے اپنے گرد انڈے کی طرح سفید خول چڑھائے ہوئے ملتا ہے۔ خوش اخلاق با کردار، اصول پرست، معاشرتی خرابیوں سے نالاں اور اخلاقی انحطاط سے پریشان۔ مگر جب معاملہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگ گندے انڈے کی طرح ہیں۔ لوگ صرف اس وقت تک اچھے انڈے ثابت ہوتے ہیں جب تک ان کے مفادات اور خواہشات کے تحت معاملات چل رہے ہوں۔ مگر جیسے ہی ان کی انا کے خول پر ضرب لگے، ان کے مفادات کا گھروندا بکھرنے لگے، ان کی خواہشات کا محل مسمار ہونے لگے، ان کے تعصّبات کا علم سرنگوں ہونے لگے، گندے انڈے کا سفید خول ٹوٹتا ہے اور اس کے اندر سے غلاظت اور بدبو کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

لوگ وعدہ کرتے ہیں مگر پورا نہیں کرتے۔ لوگ بولتے ہیں مگر سچائی سے کام نہیں لیتے۔ لوگ تنقید کرتے ہیں مگر عدل و انصاف کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ اپنے نیک و صالح ہونے کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے ہیں۔ اپنی پاکدامنی کا قصیدہ بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ اپنی پاکیزگی نفس کے ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ لوگ گندے انڈے ہیں۔ یہ گندے انڈے معاشرے کی اعلیٰ روایات کو ختم کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو

کبھی ان کے الفاظ کے ترازو میں نہیں تولنا چاہیے بلکہ عمل آئینے میں ان کی تصویر دیکھنی چاہیے۔

میڈیا اور عورتوں کی نمائش

''لوگوں کی نگاہوں میں مرغوبات دنیا: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتی کھبادی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کا سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔ ان سے کہو کیا میں تمھیں ان چیزوں سے بہتر چیز کا پتا بتادوں؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن میں نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی''، (آل عمران 3:15-14)

قرآن کریم کی اس آیت میں مرغوبات دنیا کی جو فہرست بیان کی گئی ہیں اس میں سرفہرست عورتوں کی محبت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بات کو کسی اور نے سمجھا ہو یا نہیں، میڈیا انڈسٹری کے لوگوں نے خوب سمجھا ہے۔

دور جدید میں الیکٹرونک میڈیا ایک غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تعلیم، معلومات اور تفریح کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک میں جہاں مطالعہ کا زیادہ رجحان نہیں اور شرح خواندگی بھی کم ہے، وہاں الیکٹرونک میڈیا ہی لوگوں کی دلچسپی کا اصل مرکز ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ دور جدید میں عورتوں کی نمائش اور عریانی پھیلانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ فلم اور ڈرامہ بنانے والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی فلم اور ڈرامہ کو لوگوں کی بڑی تعداد دیکھے۔ اسی طرح ہر ٹی وی چینل چلانے والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے چینل کے ناظرین اکثریت میں ہوں۔ ایک ناظر کی توجہ حاصل کرنے کا سب سے سہل اور آسان نسخہ یہ ہوتا ہے کہ خوبصورت خواتین کو میک اپ اور روشنی کے ذریعے سے خوب تر بنا کر اسکرین پر لایا جائے۔ ان کی نسوانیت اور صنفی کشش کو ابھار کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ ان کے ناز و انداز اور غمزہ و ادا کے ذریعے سے لوگوں کو ان کے شوق میں مبتلا کیا جائے۔ ان کے جسم کی نمائش کر کے ویورشپ (Viewership) کو بڑھایا جائے۔ عاشقانہ اور فحش مناظر سے ناظر کی توجہ حاصل کی جائے۔ اور ضرورت پڑے تو فنکارہ کو بے لباس کر کے فن کی ''خدمت'' کرائی جائے۔

الیکٹرونک میڈیا کے اس دور میں اب گھر گھر ٹی وی اور کیبل موجود ہے۔ ہر طرح کی فلمیں بازار میں عام ملتی ہیں۔ ان کو چلانے کے بہترین آلات، وی سی آر، سی ڈی پلیئر اور ڈی وی ڈی پلئیر کی شکل میں انتہائی ارزاں قیمت پر بازار میں دستیاب ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد صبح و شام الیکٹرونک میڈیا سے استفادہ کرتی

www.ghamidi.net

ہے۔اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا، میڈیا پر دکھائی جانے والی شے اکثر و بیشتر عورت ہی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک انسان کے اندر سے حیا کے فطری جذبے کو مغلوب کر دیتا ہے ۔انسان کے حیوانی جذبات اس پر غالب آ جاتے ہیں۔آہستہ آہستہ عفت کا احساس ختم ہونے لگتا ہے۔زنا اور فحاشی انسان کو ایک معمولی عمل لگنے لگتا ہے۔

اس صورتحال کا ایک حل یہ نکالا گیا ہے کہ گھر سے ٹی وی کو نکال دیا جائے۔ یہ بظاہر مکمل حل ہے۔مگر تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ حل اکثریت کے لیے ناقابل عمل ہے اور آئندہ آنے والے دنوں میں مزید ناقابل عمل ہو جائے گا کیونکہ دور جدید میں الیکٹرونک میڈیا کو روک دینا کسی طور پر بھی ممکن نہیں رہا ہے۔

اس صورتحال کا حل وہی ہے جو مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں میں سے باشعور لوگوں نے اپنے بچوں کے حوالے سے اختیار کیا ہے۔یعنی فرد کی تربیت کی جائے ۔ایمان و اخلاق کو اس کے رگ و پے میں اتارا جائے۔اپنی تہذیب، اقدار، روایات اور فطرت میں موجود پاکیزہ جذبات کو ابھارا جائے۔حیا اور عفت کی اہمیت دل و دماغ میں راسخ کی جائے۔زنا کے نقصانات اور اس کی شناعت کو اجاگر کیا جائے۔نیز نکاح کے فطری تعلق سے، جتنا جلدی ہو سکے، نوجوانوں کو وابستہ کرنے کی تحریک برپا کی جائے۔

ان سب کے ساتھ لوگوں کو اس حوالے سے تعلیم دی جائے کہ اللہ کی جنت تقویٰ کے بغیر نہیں مل سکتی۔ یہ جنت وہ مقام ہے جہاں انسان ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سائے میں زندہ رہے گا۔دنیا میں جتنی بھی نعمتیں پائی جاتی ہیں وہ جنت میں کہیں زیادہ بہتر بنا کر انسان کو دے دی جائیں گی۔

انسان ذہنی طور پر بہت طاقتور مخلوق ہے۔ جب وہ کسی شے کے بارے میں ایک نقطہ نظر قائم کر لیتا ہے تو بنیادی جبلی جذبات پر بھی قابو پا لیتا ہے۔اس کا ایک نمونہ رمضان کے روزے ہیں جب لوگ اللہ کے لیے کھانا پینا تک چھوڑ دیتے ہیں۔اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ جب انسانوں کی تربیت اس طرح کی جائے گی تو وہ خود اور اپنے اہل خانہ کو الیکٹرونک میڈیا کی پھیلائی ہوئی اس آلودگی سے بچانے کے قابل ہو جائیں گے۔

اللہ کا ذکر اور اطمینان قلب

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو دلوں کے اطمینان کا ذریعہ بتایا ہے (الرعد 13:28)۔مگر ہمارے ہاں لوگ عام طور پر یہ شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ اللہ کا ذکر کر کے بھی دل بے چین و مضطرب رہتا ہے۔ وہ صبح و شام تسبیحات پڑھتے ہیں، مگر پھر بھی زندگی حزن و ملال اور بے چینی و انتشار میں گزرتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس آیت میں اطمینان سے مراد سکون کی وہ کیفیت نہیں ہے جو کسی نشے کو اختیار کرنے کے بعد اانسان پر طاری ہو جاتی ہے۔اور جس کے بعد انسان دنیا و مافیہا کے ہر غم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہاں اطمینان سے مراد وہ ذہنی کیفیت جس میں انسان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ جس ہستی پر وہ ایمان لایا ہے، جس کو اس نے اپنا رب اور اپنا معبود مانا ہے، وہی در حقیقت خالق و مالک ہے۔اسی کے ہاتھ میں کل کائنات کی بادشاہی ہے۔اور جس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا، اللہ تعالیٰ اسے کبھی رسوا اور محروم نہیں کرے گا۔

تاہم یہ یقین اللہ کے جس ذکر سے پیدا ہوتا ہے وہ محض تسبیح پر انگلیاں پھیرنے کا عمل نہیں بلکہ اس کی یاد میں جینے کا نام ہے۔ یہ محض کچھ اذکار کو زبان سے ادا کرنے کا عمل نہیں، اس کے ذکر سے منہ میں شیرینی گھل جانے کا نام ہے۔ یہ اس کے نام کی مالا جپنے کا عمل نہیں، ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ سمجھنے کی کیفیت کا نام ہے۔ یہ اللہ ھو کا ورد کرنے کا عمل نہیں، رب کی محبت اور اور اس کے ڈر میں زندگی گزارنے کے نام ہے۔اس یاد کی بڑی خوبصورت تعبیر فیض نے یوں کی ہے۔

رات یوں دل میں تیری بھولی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

قرآن نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اطمینان قلب کی وہ کیفیت جس میں انسان کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ کوئی اندیشہ اللہ کے دوستوں عطا کی جاتی ہے۔فرمایا:

سن لو کہ اللہ کے دوستوں کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ کوئی اندیشہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے۔ان کے لیے خوشخبری ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔یہی بڑی کامیابی ہے۔(یونس 10:64-62)

یہاں قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اللہ کے یہ دوست کون ہوتے ہیں؟ یہ کوئی ''بزرگ'' قسم کے لوگ نہیں بلکہ وہ سچے اہل ایمان ہیں جو اپنے ایمان کا ثبوت تقوی سے دیتے ہیں۔یعنی رب کی یاد ان کا احاطہ اس طرح کر لیتی ہے کہ زندگی کے ہر کمزور لمحے میں وہ یہ سوچ کر گناہ سے دور بچتے ہیں کہ اللہ میرے ساتھ ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔یہی لوگ

اللہ کے ولی اوراس کے دوست ہیں۔اور جو اللہ کا دوست ہو وہ کیسے کسی خوف وحزن کا شکار ہوسکتا ہے۔

اس بات کوایک مثال سے سمجھیں۔اگر کسی شخص کی پاکستان کے صدر مملکت سے براہِ راست دوستی ہوجائے تو پھر پاکستان میں کوئی سرکاری محکمہ اسے تنگ نہیں کرسکتا۔کہیں اس کا کام پھنس نہیں سکتا۔جب ایک فانی انسان کا یہ حال ہے تو جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست قرار دیدے،ان کے معاملات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔وہ ایمان وتقوی کے ساتھ زندگی گزرتے ہیں اور اللہ انہیں ہر خوف وحزن سے محفوظ رکھتا ہے۔وہ اللہ کی یاد میں جیتے ہیں اور اللہ ان کے دل کو اطمینان سے بھردیتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں پر تکالیف بھی آتی ہیں بلکہ اکثر انھی پر آجایا کرتی ہیں تو پھر یہ لوگ کس طرح خوف وحزن سے محفوظ ہوئے۔اس کا جواب یہ ہے کہ حزن وخوف دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔جو لوگ اللہ کی یاد میں جیتے ہیں،ان کے اردگرد وقتی طور پر پریشان کن حالات پیدا ہوسکتے ہیں،مگر ان کے قلب پر اطمینان کی وہ کیفیت رہتی ہے جس سے انسان ہمیشہ پرسکون رہتا ہے۔اس کا سب سے اچھا نمونہ خود حضور پاک کی اپنی سیرت ہے۔آپ کو اپنی زندگی میں متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور ہجرت کے موقع پر تو خون کے پیاسے لوگ آپ کو تلاش کرتے کرتے غارِ ثور تک آپہنچے۔آپ کے ساتھ سوائے حضرت ابوبکرؓ کے اور کوئی نہ تھا۔مگر آپ اس موقع پر ذرہ برابر بھی خوفزدہ نہ ہوئے بلکہ جب حضرت ابوبکرؓ آپ کی طرف سے فکر مند ہوئے تو آپ نے ان کو اس طرح تسلی دی کہ اے ابوبکر ان دو کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا رفیق خود اللہ ہے،(ماظنك يا ابا بكر باثنين الله ثالثهما، رواہ بخاری، رقم 3453)۔

ایک بندہ مومن پر جب زندگی کی مشکلات آتی ہیں تو اس کا ایمان اسے بتاتا ہے کہ اللہ چاہے تو با آسانی اسے ان مشکلات سے نکال سکتا ہے۔چنانچہ وہ اپنے رب ہی کو پکارتا اور اسی سے مدد چاہتا ہے۔جس کے نتیجے کے طور پر اللہ تعالیٰ اسے اس مشکل سے نجات عطا کردیتے ہیں۔تاہم اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ یہ مشکلات،اگر دور نہیں ہورہیں تب بھی،جنت میں اس کے درجات بلند کرنے کا سبب بن رہی ہیں اور آخرت کے دکھوں سے اسے بچارہی ہیں۔چنانچہ مشکلات وتکالیف بھی اسے یہ اطمینان فراہم کرتی ہیں کہ اس کی تکلیف کا ہر اک لمحہ جنت میں اس کی راحتوں میں اضافہ کا سبب بنے گا۔جو شخص اطمینان کی اس کیفیت میں جیتا ہو،اس کے سکون قلب کے کیا کہنے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے امتحان کی تیاری میں مصروف کوئی قابل طالبعلم رات بھر جاگتا اور نیند کی راحت سے محروم

رہتا ہے۔ مگر اسے یہ تکلیف اس لیے گوارا ہوتی ہے کہ وہ آنے والے دنوں میں اس کا بہترین نتیجہ دیکھے گا۔ یا کوئی کاروباری شخص اپنے کاروبار میں پیسے لگاتا ہے اور مشقت اٹھاتا ہے، اس امید پر کے آنے والوں دنوں میں اسے بھرپور منافع ملے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کی یاد میں بڑا سکون ہے۔ مگر اس شخص کے لیے جو ایمان وتقوی کی کیفیات میں جیتا ہو۔ نہ اس شخص کے لیے جسے عام حالات میں نہ اللہ یاد رہے نہ آخرت بلکہ اس کی زندگی کا مقصود دنیا کی لذتیں ہوں۔ ہاں اسے کبھی تکلیف پہنچ جائے تو اس تکلیف سے نجات پانے کے لیے وہ وظیفے پڑھنا شروع کر دے اور سمجھے کہ یہ اللہ کی یاد ہے جس سے اسے سکون مل جائے گا۔

---

www.ghamidi.net